قتیل اور غالب

از

سید اسد علی انوری فرید آبادی، بی۔ ایس سی۔ آئی۔ ایف۔ ایس۔

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنو

مطبوعہ جید برقی پریس دہلی

طبع اول ۱۰۰۰ ۱۹۳۶ء قیمت

سردہ پرور دن مبارک کار نیست
خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست — غالب

قتیل اور غالب

ع ۔ غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ — غالب

غالب اردو شاعری کے ہیرو ہیں

انگریزی راج کی اور "پاکستان" سے تو خواہ ہندوستانی "منکر" ہو جائیں لیکن ایک چیز جو غالباً آسانی سے نہ "جھٹلائی" جا سکے وہ وطن پرستی کا وہ شدید قسم کا احساس ہے جو اب کوئی پچاس ساٹھ برس ادھر سے خاص قوت کے ساتھ ہمارے افعال اور ارادوں میں کارفرما ہے۔ یوں کہئے کہ تو ہمارے برادرانِ وطن اس جذبے کی بنیاد بھی وید یا شاستر کے کسی اشلوک میں ثابت کر دکھائیں گے کیونکہ ان کے نزدیک روئے زمین پر کوئی ایسی چیز نہ ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے جس کا مفصل ذکر وید میں پہلے ہی سے موجود نہ ہو۔ حتیٰ کہ:۔

وید میں ریل، بان[1] اور تار[2]
وید میں ہے سارا سنسار

---

[1] بان بمعنی ہوائی جہاز
[2] تار بمعنی تار برقی

یا مسلمان کہیں کہ :-

ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے — گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے — قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

لیکن اس کے باوجود ہماری زندگیاں اور ہمارے نقطۂ نظر ناقابلِ اذکار حد تک اس جذبہ اور احساس سے متاثر ہوتے جاتے ہیں۔ اسی اثر کے ماتحت زبان اور ادب کو ایک خاص نیت اور خاص کوشش کے ساتھ اُبھارا جا رہا ہے۔ اور شہسوارانِ میدانِ ادب کو اس مقام پر لانے کی کوششیں ہیں جس کے گو وہ ہر طرح اہل تھے لیکن زمانے کی ناقدری نے ان کو وہاں تک پہنچنے نہ دیا تھا۔ ان مساعی کی مبارک ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہی کی بدولت ہمارے ادب کے وہ درخشاں ستارے پورے طور پر منظرِ عام پر آئے ہیں جن کا کلام دنیا کی کسی بھی زبان کے ادب کے لئے باعثِ صد افتخار ہو سکتا ہے۔ انہی میں مرزا غالب بھی ہیں اور سچ یہ ہے کہ وہ اس مجموعے میں بمنزلہ ماہتاب ہیں۔ اُردو ادب خصوصاً شاعری میں مرزا غالب کا درجہ بلند ہی نہیں بلکہ بلند ترین ہے۔ وہ اُردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں اور اس حیثیت سے ہم جتنی بھی ان کی قدر کریں اور جتنا بھی ان کے نام کو اُبھاریں کم ہے۔ مولانا حالی مرحوم نے یادگارِ غالب لکھ کر سب سے پہلے یہ خدمت انجام دی اور پھر اس کے بعد تو غالب پر مضامین کا تانتا بندھ گیا۔ ان کے کلام کی متعدد شرحیں شائع ہوئیں۔ اور ہو رہی ہیں۔ ان کی شاعری کے "فلسفہ" اور "پیغام" پر نئے نئے

مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ ان کے ذہنی ارتقا کو ان کے دیوان کے مختلف اڈیشنوں کی مدد سے جانچا اور تولا جا رہا ہے۔ ان کے کلام میں قنوطیت اور رجائیت، رشک اور بدگمانی، صبر اور شکوہ، ہجر اور وصل، وفا اور جفا، التفات اور بے اعتنائی، سادگی اور پرکاری، لاگ اور لگاؤ غرضکہ ہر جذبے کو پرکھا جا رہا ہے۔ ان کے رقعات کے مختلف اڈیشن شائع ہو رہے ہیں اور اب کچھ عرصے سے ان کے سوانح حیات بھی محقق کی عقابی نظروں سے محفوظ نہ رہ سکے ہیں۔

ہیرو کو ہیرو بنائے رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی سوانح حیات میں جزوی تحقیقات نہ کی جائے

مرزا غالب کی نثر و نظم کے جواہر پاروں کو نئے سے نئے زاویہ نگاہ سے دیکھنا اور ملک کے سامنے پیش کرنا اصل میں ان کی خدمت نہیں بلکہ خود اپنے ادب، اپنی روایات اور اپنے تمدن کی خدمت ہے کہ جس سے ہندی مسلم تہذیب کو بقا اور دوام حاصل ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک سوانح حیات کا تعلق ہے۔ ہمارا خیال عام اور متعارف نظریہ سے بالکل مختلف ہے۔ کسی کو قومی ہیرو بنا لینے کے بعد اس کے پرستاروں میں غیر محسوس طریقہ پر یہ چیز سرایت کر جاتی ہے کہ اس ہیرو میں کسی قسم کی بھی کمی یا کمزوری نہیں ہے۔ اور یہی راز ہے ہیرو کو ہیرو سمجھتے رہنے کا۔ ورنہ شاید اس نفسیاتی حقیقت سے کسی کو انکار نہ ہو کہ اگر ہیرو میں خطا اور غلطی یا وہ چھوٹی چھوٹی اور ہلکے درجے کی کمزوریاں جو عوام میں پائی جاتی ہیں مان لی جائیں تو پھر وہ ہیرو نہیں رہ سکتا۔ یہیں سے حقیقت اور ضرورت کا تنافر اور تصادم ظاہر ہے۔ ضرورت کا تقاضا

ہے کہ ہیرو کو ہر غلطی سے مبرا اور ہر خوبی سے متصف بتایئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ نبی کے علاوہ ہر انسان مرکب من الخطا ہے۔ یہ مانا کہ اس حقیقت کے باوجود انسان انسان بھی رہ سکتا ہے اور ہیرو بھی بن سکتا ہے۔ لیکن یہ بات، خصوصاً ہیرو کے متعلق اکثریت کے ذہن سے اکثر نکل جاتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ہیرو کا بننا یا بگڑنا اکثریت پر منحصر ہے نہ کہ ان چند حق بیں اور حق گو حضرات پر جو کسی شخص کی غلطیوں کو جانتے اور مانتے ہوئے بھی اس کی خوبیوں کی کما حقہٗ داد دے سکتے ہیں۔ اسی لئے ہمارا خیال ہے کہ اپنے ہیروؤں کے نجی حالات اور سوانح حیات کو بہت زیادہ محققانہ نظر سے نہیں دیکھنا چاہیئے۔ کیونکہ اس کے علاوہ حقیقت اور ضرورت میں تطابق کرنے کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا۔ ہمارے نزدیک مناسب صورت صرف یہی ہے کہ ان گرانمایہ اور قابل قدر خوبیوں کو توحتی المقدور ابھارا اور اچھالا جائے جنکی وجہ سے کسی ہیرو کا نام زندہ ہے لیکن اس کے علاوہ اس کی زندگی کی دیگر غیر ضروری باتوں کو بس ایک مبہم اور عام طریقہ پر ظاہر کر دینے کے بعد اس میں تحقیق و تدقیق کو زیادہ دخل نہیں دینا چاہیئے۔ کہ یہ "کوہ کندن و کاہ بر آوردن" ہی نہیں بلکہ اکثر "جتنا چھانو اتنا ہی کرکرا" کے مصداق ہوتا ہے۔ معمولی سے معمولی اور جزوی سے جزوی بات تو اس شخص کی تلاش اور جستجو سے معلوم کی جائے جس کے متعلق یقین ہو کہ اس کا ہر فعل اور ہر ارادہ قابل ستائش اور دنیا کے لئے مشعل راہ ہوگا۔ جیسا کہ آنحضرت صلعم کہ احادیث و سیر کی کتب صحیحہ کی یہ فراوانی حضور کی خصوصیات کو اور بہتر سے بہتر طریقہ پر دنیا کے سامنے

پیش کرتی ہے ۔ عام انسانوں کے لئے تو یہ خورد بینی اور ژرف نگاہی صرف ایسے ہی نتائج پیدا کر سکتی ہے جو ان کی شہرت کے منافی ہوں۔ اور یہ بدیہی سی بات ہے۔ کیونکہ جو خوبیاں ان کی شہرتِ عام اور بقائے دوام کی ضامن ہیں وہ تو ظاہر ہیں ہی۔ اب جو باتیں زمانے نے بھلا دیں وہ وہی ہو سکتی ہیں جو گویا اتنی اعلیٰ درجہ کی اور خصوصی نہ تھیں کہ مرورِ زمانہ سے عہدہ برآ ہو سکتیں ۔ پھر اگر ان سب باتوں کو بہ تفصیل تمام معلوم کرنے کی کوشش کی جائے تو ظاہر ہے کہ وہ یا تو زیادہ سے زیادہ "خامی" نکلیں گی اور یا پھر "رنگینی" ۔ اعلیٰ درجہ کی تو ہو نہیں سکتیں ۔ کہ اگر ایسی ہوتیں تو خود زندہ رہتیں ۔ مختصر یہ کہ اس قسم کی تحقیق و تدقیق شروع تو اس نیت سے ہوتی ہے کہ شخصِ مخصوص کو زندہ رکھا جائے ۔ اس کی ایک ایک بات کو جلایا جائے اور گویا اس کی خدمت کی جائے ۔ اور ختم اس پر ہوتی ہے کہ جتنی عظمت اور قدر پہلے تھی وہ بھی نہیں رہتی ۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ اپنے قومی ہیروؤں کی سوانح عمریاں لکھی ہی نہ جائیں ۔ اور ان کو محض دیومالا کے افراد بنا کر چھوڑ دیا جائے ۔ یہ تو گویا خودکشی کے مترادف ہوگا ۔ لیکن ہمارا یہ ضرور خیال ہے کہ مخصوص خوبیوں کے علاوہ (جن کی زیادہ سے زیادہ توصیف و تشہیر ہونی چاہیئے) ان حضرات کے دیگر خد و خال ابھارنے میں بہت زیادہ باریک بینی کی ضرورت نہیں ۔ کیوں کہ پھر یا تو ان ہستیوں کی پہلی سی عظمت ہمارے دلوں میں نہ رہ سکے گی اور یا پھر سوانح نگار کو دانستہ ہٹ دھرمی اور تعصب سے واقعات میں تصرف و تبدیلی کرنی ہوگی ۔

سوانح حیات میں ضرورت سے زیادہ تحقیق نے غالب کی عظمت کم کردی

اصل میں ذکر مرزا غالب کا تھا۔ اگرچہ خود انھوں نے فارسی کے مقابلے میں اپنی نظم ونثر اُردو کو ہمیشہ کم مایہ اور اپنی شہرت کے منافی سمجھا بلکہ اس زبان میں کلام تک کرنا ننگ سمجھتے رہے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ان کی موجودہ شہرت محض اور مطلق ان کی اُردو نظم ونثر کی بدولت ہے۔ لہٰذا ہماری ساری کوششیں انہی دو چیزوں کو بہتر سے بہتر رنگوں میں اور معقول سے معقول زاویۂ نگاہ سے پیش کرنے میں صرف ہونی چاہئیں۔ جہاں تک سوانح حیات کا تعلق ہے وہ مختصراً اور اس نیت سے لکھی جائیں کہ ان کی زندگی کے اچھے پہلو اور زیادہ روشن ہوجائیں۔ یعنی بے جا تعصب اور غلط بیانی کی بھی ضرورت نہ پڑے اور ان کی ہستی کی "تاریخی حیثیت بھی قایم ہو جائے۔ اس نظر سے دیکھئے تو ماننا پڑیگا کہ حالی مرحوم کی یادگارِ غالب نہ صرف غالب کی پہلی سوانح عمری ہونے کی وجہ سے ممتاز ہے بلکہ یوں بھی بے عدیل اور بے نظیر ہے۔ خواجہ حالی طبعاً غلط بیانی اور بے جا تعصب کو برداشت نہ کرسکتے تھے لیکن انھوں نے سوانح نگاری کے حسب بالا اصول اور مفہوم کو خوب سمجھ لیا تھا۔ وہ خود حیات جاوید کے دیباچہ میں کہتے ہیں کہ یہ تصویر یک طرفی ہے۔ اور اس کتاب میں مصنف نے مرزا کے "کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی"۔ اب آپ یادگارِ غالب پڑھ جاتیے۔ بعض محض سطحی واقعات یا ان کی تاریخ و توقع کی تقدیم وتاخیر کے متعلق بعض فروگذاشتوں کے علاوہ کہیں بھی آپ ناجائز تعصب

کا اثر نہ پائیں گے۔ اور اس کے باوجود غالب اور ان کی زندگی کا جو خاکہ اس کو پڑھ کر ہماری نظروں کے سامنے کھچ جاتا ہے اس سے بہتر ممکن نہیں۔ شاعری کے علاوہ ان کی خصوصیات میں ان کی ذہانت، طباعی، حاضر جوابی، ظرافت، فہم و ادراک مابہ الامتیاز تھیں اور یہی وہ چیزیں ہیں جن پر یادگار نے خصوصیت سے اور نہایت ہی دلچسپ اور دلفریب طریقوں سے زور دیا ہے۔ اس سے زیادہ تحقیق کی نہ ضرورت تھی اور نہ غالب کی زندگی اس کی متحمل ہو سکتی تھی۔ اسی طرح ان کا مروجہ اُردو دیوان اور نثر میں عود ہندی اور اُردوئے معلیٰ ان کی شہرت کے لئے کافی تھیں۔ اس کے علاوہ گو اُردو میں ان کے بہت سے اور بھی اشعار تھے وہ خود غالب ہی نے نہایت معقول وجہ کی بنا پر نظر انداز کر دئے تھے۔ مختصراً غالب کا مروجہ اُردو دیوان، غالب کی اُردو نثر اور یادگارِ غالب یہ تین چیزیں ہیں جنھوں نے غالب کو غالب بنایا[۱] لیکن اب جو تحقیق اور

---

[۱] اس کے اعادہ کی تو کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی کہ غالب کی شہرت میں ان کی فارسی نظم و نثر کو کوئی دخل نہیں۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ان کی فارسی شاعری بہت بلند پایہ ہے۔ تب بھی اس کی قدر دانی کے لئے ہندوستان میں کوئی گنجائش نہیں۔ ان سے بہت بہتر ہندی نثراد فارسی شاعروں مثلاً خسرو و بیدل وغیرہ کی کون قدر کر رہا ہے جو غالب کو کوئی پوچھتا۔ مرزا کی فارسی نثر تو بلاشبہ کچھ بہت اچھی بھی نہیں۔ "غالب نامہ" کا فیصلہ سنئے "جہاں تک معنی کا تعلق ہے اس پر انکی پیاز کی مثل صادق آتی ہے کہ چھلکے ہی چھلکے ہیں (بقیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

باریک بینی کی روحلی تو غالب کو ابھارنے کی بجائے اور ڈبو دیا۔ پہلے شاعری ہی کو لیجئے۔ بڑی کوشش اور کاوش سے نسخہ حمیدیہ چھپوایا گیا لیکن اہلِ نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اس سے غالب کی شاعرانہ عظمت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ گو یہ صحیح ہے کہ خود غالب نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ

(بقیہ فٹ نوٹ از صفحہ گذشتہ) مغز کا نام نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ مہرِ نیمروز ہے جو مغلیہ بادشاہوں کی تاریخ ہے اور جس کی تاریخی اہمیت اس وجہ سے کہ آخری مغلیہ بادشاہ کے زیرِ فرمان درباری مورخ نے لکھی بہت ہونی چاہیئے کچھ بھی نہیں۔ اس کے دوسرے حصے کے لکھنے کی نوبت نہیں آئی ...... ممکن ہے بہادر شاہ جو سادہ اور سوز طرزِ تحریر پسند کرتا تھا اسے مرزا کی ٹیڑھی ترکیبیں اور استعاروں اور تشبیہوں کے انبار میں اصل مطلب خبط کر دینا ناپسند ہوا ہو اور اس نے اس کی تکمیل غیر ضروری سمجھی ہو" صفحہ ۶۸ و ۶۹۔ اسی طرح مرزا کی اس درخواست پر کہ دستنبو سرکاری خرچ پر طبع کی جائے حکم ہوا کہ اس کی زبان پرانی قسم کی فارسی ہے جو اب نامانوس اور بعید الفہم ہے۔ اس لئے حکومت کا اسے اپنے خرچ سے شائع کرنا بے سود ہے" ذکرِ غالب صفحہ ۶۱ و ۶۲۔ مرزا کی فارسی شاعری کے متعلق بھی شیخ محمد اکرام صاحب کی رائے سنئے :۔" غالباً یہ صحیح ہے کہ جو قوتِ اظہار ان کو (غالب کو) اُردو پر تھی وہ فارسی پر حاصل نہ ہوئی۔ اور خواہ مرزا خود کچھ کہیں لیکن شاعرانہ نقطۂ نظر سے دیوانِ اردو کو مرتبہ دیوانِ فارسی سے کسی قدر بلند ہی ہے" غالب نامہ صفحہ ۱۲۴۔ نظم و نثر پر ایک مجموعی رائے بھی سن لیجئے :۔" مرزا کو اپنے فارسی قصائد اور فارسی نثر پر بے حد ناز تھا اور فارسی غزلگوئی میں بھی وہ خواجہ حافظ کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ لیکن باوجودیکہ ہم مرزا کے فارسی کلام کی اہمیت مانتے ہیں، مرزا اسے جس قدر بلند پایہ سمجھتے تھے اس سے متفق ہونا کسی طرح ممکن نہیں" صفحہ ۱۵۰ غالب نامہ

مروجہ دیوان کے علاوہ جو اشعار ہوں وہ میرے نہ سمجھے جائیں کہ وہ میری شہرت کے منافی ہیں[۹۱]۔ لیکن اب نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت کے بعد یہ معلوم ہو گیا کہ مروجہ مختصر سا دیوان ایک ضخیم اور اکثر و بیشتر نہایت ناپسندیدہ دفتر کا انتخاب ہے جو مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی صدر الدین آزردہ اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی جوہر بیں نظروں کا رہون منت ہے۔ شیخ محمد اکرام صاحب کے بقول "حقیقت یہ ہے کہ اگر دیوان غالب تمام کا تمام شائع ہو جاتا تو خدشہ تھا کہ جہاں اتنے سیپ اور کوڑیاں تھیں وہاں سچے موتی بھی نظر سے نہاں ہو جاتے[۹۲]" پھر آگے فرمایا "اردو ادب ان کا (مرزا کے معاصرین کا) ممنون ہے کہ انھوں نے تنقید اور تمسخر سے مرزا کو ان سرخ و سفید خزف ریزوں کو جمع کرنے سے روکا[۹۳]" اس طرح تو پھر اکثر شعراء کے کلام کا انتخاب ہو سکتا ہے جو اگر غالب کے دیوان سے اچھا نہیں تو کچھ بہت برا بھی نہ ہو گا۔ ممکن ہے دوسروں کا منتخب دیوان حجم میں شاید اور بھی کچھ کم ہو۔ لیکن اس کے علاوہ غالب میں کوئی خاص خوبی باقی نہیں رہتی۔ تھوڑے سے بہت اچھے شعر تو ہر ایک شاعر کہہ ہی لیتا ہے۔ سید انشا اللہ خاں انشا کی ایک کنیزک چنبیلی نام یاسمن تخلص کرتی تھی۔ اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو:-

یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت ☆ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

۹۱:- غالب نامہ صفحہ ۱۵۰

۹۲:- " " ۲۷

۹۳:- " " ۱۵۱

یہ خیال رہے کہ یہ شعر غالب سے پہلے کا کہا ہوا ہے[۵۱]
یا بعض حضرات نے نہایت جستجو سے غالب کی بعض غیر مطبوعہ غزلیں ڈھونڈ نکالیں۔ ان میں سے ایک کا ایک شعر سنئے :-

مرزا سے کہو کیا خاک ساتھ سونے کا ہو رکھے جو بیچ میں وہ شوخِ سیمتن تکیہ

ظاہر ہے کہ ایسی تحقیق غالب کی شہرت میں ممد و معاون نہیں ہو سکتیں۔

اسی طرح مرزا محمد عسکری صاحب نے مرزا کے رقعات میں سے وہ رقعات جن میں ادب اور علم کے متعلق کوئی بات تھی الگ کر کے مقدمہ دیباچہ ضمیمہ اور حاشیہ کے ساتھ شائع کئے ہیں۔ لیکن اس تحقیق کا نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا کو معلوم ہو گیا کہ مرزا کو اپنے اقوال کی تردید اور اپنے معروضات کی تکذیب میں باک نہ تھا[۵۲] یا یہ کہ وہ اس قدر مرنجان مرنج اور سب کی

---

۵۱ :- تذکرہ نسیم سخن از مولوی عبدالحیّ صاحب صفا بدایونی

۵۲ :- رقعہ نمبر ۲۹ میں فرمایا ہے :- "یہ نہ سمجھئے کہ بڑا رونا رزق کا ہے۔ جب معاش مقرر ہو تو پھر غم کیا ہے۔ نا صاحب یہ باتیں جانوروں کی ہیں کہ کچھ کھا لیا پانی لیا چین سے سو رہے۔ آدمی عموماً اور صاحبانِ ننگ و ناموس خصوصاً باوجود فراغِ معاش ہزار جانگداز بلاؤں میں مبتلا ہیں" رقعہ ۷۴ میں کہتے ہیں" دنیا میں نام آور ہونے سے کیا اور گم نام جئے تو کیا۔ کچھ وجہ معاش ہو اور کچھ صحت جسمانی۔ باقی سب وہم ہے اے یارِ جانی' ہر چند وہ بھی وہم ہے مگر میں ابھی اسی پایہ پر ہوں"۔ اس کے علاوہ معیار زبان و زبان دانی اساتذہ، آراء' ادعا کے متعلق جو جو مرزا نے صفحہ صفحہ پر بدلے ہیں ان کا مفصل ذکر اس مضمون کے آخر میں صفحہ ۹۱ وغیرہ پہ کیا گیا ہے۔ جہاں یہ ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے۔

بھلائی چاہنے والے نہ تھے جیسا کہ یادگار پڑھنے سے اندازہ ہوتا تھا بلکہ ان کے اعتراض کے نشتر کی قطع برید خاصی عام تھی۔ اور اس میں وہ حق و انصاف کا بھی زیادہ پاس نہیں رکھتے تھے ۵؎

لیکن جس چیز نے مرزا غالب کو سب سے زیادہ عریاں کیا وہ تو وہ تحقیقات ہیں جو ان کی سوانح حیات میں کی گئی ہیں۔ غالب پرست سوانح نگار چاہتا ہے کہ ہر خوبی مرزا میں "ثابت" کر دکھائی جائے۔ لیکن واقعات ایک قدم بھی ساتھ نہیں دیتے۔ یوں تو تقریباً ساری معروضہ خوبیاں خود ان سوانح نگار حضرات کی تحقیقات سے ہو سکتی ہیں لیکن مثال کے طور پر حسب ذیل غالباً کافی ہوں:۔

مرزا خود فرماتے ہیں ع نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

سوانح نگاروں نے بھی مرزا کی خودداری اور بے نیازی کو باہتمام بیان کیا ہے۔

۵؎ خواجہ غلام غوث بے خبر کے نام کے خط میں مرزا نے میر انیس کے شعر ؎ ہے سہل ممتنع یہ کلام ادق مرا + برسوں پڑھے تو یاد نہ ہووے سبق مرا + کا مطلب بتایا ہے۔ مرزا محمد عسکری صاحب مؤلف ادبی خطوط غالب اس کے متعلق فرماتے ہیں:۔ "یہ شعر میر انیس مرحوم کا مرزا صاحب کے اعتراض بے جا کا گھائل ہے + مرزا صاحب نے اس کے معنی سمجھنے میں غلطی کی اور اس پر اعتراض وارد کرنے میں زیادتی کی ہے" صفحہ ۹۰ + غصہ میں دانستہ غلط بھی فیصلے دے دیتے تھے اسی کتاب کے صفحہ ۹۵ ا پر مرزا تفتہ کے نام کے خط میں فرماتے ہیں "حلقہ زا کی زے پر نقطہ نہ تھا میں نے غصہ میں لکھا کہ نہ حلقہ را درست نہ حلقہ زا درست" (ورنہ یوں حلقہ زا درست ہے)۔ عبد الواسع۔ مولوی غیاث الدین قتیل وغیرہ پر جو زبردستی کے اعتراض کیے گئے ہیں ان کا ذکر آگے آئے گا۔

"یادگار" کے مطالعہ نے یہ نقش پیدا کرنے میں بڑی مدد دی تھی۔ لیکن نئی تحقیق کا بھلا ہو کہ اس واہمہ کا تار پود بکھیر کر رکھ دیا۔ اصل یہ ہے کہ مرزا غالب کی قصیدہ خوانی بھٹئی تک پہنچ گئی تھی۔ جہاں ذرا سے بھی فائدے کی امید نظر آتی تھی یہ جھٹ اپنا قصیدہ پیش کر دیتے تھے۔ اپنا مسلک خود بیان فرماتے ہیں "اشعارِ تازہ مانگتے ہو کہاں سے لاؤں .... گورنمنٹ کا بھاٹ بھٹئی کرتا تھا۔ خلعت پاتا تھا۔ خلعت موقوف بھٹئی متروک[۱۵]" + ہندوستانیوں میں دلّی میں بادشاہ سلامت اور ولی عہد لکھنؤ میں بادشاہ غازی الدین حیدر، شاہ نصیر الدین حیدر، امجد علی شاہ، واجد علی شاہ، معتمد الدولہ وزیر اور روشن الدولہ وزیر، رام پور میں نواب یوسف علی خاں، نواب حامد علی خاں اور نواب کلب علی خاں، حیدر آباد میں سر سالار جنگ اور شمس الامراء، ٹونک میں نواب وزیر الدولہ، الور میں راؤ راجہ بنی سنگھ اور راجہ شیو دھیان سنگھ، پٹیالہ میں راجہ نریندر سنگھ، کالپی میں نواب انوار الدولہ، فرخ آباد میں نواب نصیر الدولہ، لوہارو میں نواب امین الدین احمد خاں، مہاراجہ جے پور، مہاراجہ گوالیار، میر ابراہیم علی خاں سورتی وغیرہ غرضکہ ہر ممکن دروازہ کھٹکھٹایا۔ پھر اگر انعام نہ پاتے تھے تو تقاضے کئے جاتے تھے۔ اور صلہ نہ ملنے پر آزردہ ہوتے تھے۔ اور اس کا برسوں چرچا رہتا تھا۔ نواب انوار الدولہ کے پاس سے قصیدہ کی کوئی رسید نہ ملی تو ان کو القاب میں "امیدگاہ" کے بجائے

---

[۱۵] بنام نواب علاؤ الدین لوہارو۔

"امید کاہ" بکافِ فارسی لکھا شمس الامرا اور سر سالار جنگ کے پاس سے رسید نہ آنے پر کئی دفعہ منشی حبیب اللہ ذکا حیدر آبادی کو لکھا۔ ٹونک سے انعام نہ ملا تو برہم ہو گئے۔ اور وزیر الدولہ کی ہجو تک لکھ ڈالی[۹۱] لیکن غالب کچھ نہ تھے اگر اول درجے کے موقعہ شناس نہ تھے۔ ہندوستانیوں سے تو زیادہ کچھ روپیہ کی امید تھی ان کا جذبہ جاہ طلبی ہندوستان کے درباروں سے مطمئن ہونے والا نہ تھا۔ وہ وقت ہندوستانیوں کے ادبار کا تھا۔ انگریزوں کو عروج تھا۔ غالب نے شاید ہندوستانی شعراء میں سب سے پہلے انگریزوں کی خوشامد کرنی شروع کی اور اس سلسلے میں ملکہ وکٹوریا سے لے کر معمولی ریذیڈنٹ اور سکرٹری بلکہ کلکٹر تک کم و بیش پندرہ انگریزوں کی شان میں اٹھارہ قصائد لکھے[۹۲] انگریزوں کے پاس سے جواب آنے سے اور ان کی خوشنودی سے غالب کو بڑی مسرت حاصل ہوتی تھی[۹۳] بعض دفعہ خاصی تذلیل بھی ہو جاتی تھی لیکن وہ باز نہ آتے تھے[۹۴] نوابوں اور حاکموں سے گذر کر مرزا کو اپنے دوستوں سے

---

۹۱ غالب از مہر صفحہ ۲۷۷

۹۲ غالب از مہر صفحہ ۲۶۹ و ۲۷۰

۹۳ ادبی خطوط غالب صفحہ ۴۴

۹۴ غدر کے بعد غالب نے ملکہ وکٹوریا اور حکام عالی شان کی تعریف میں قصائد لکھ کر حکام دہلی کی معرفت ارسال کئے۔ لیکن ۱۷ مارچ ۱۸۵۸ء کو کمشنر دہلی نے یہ لکھ کر واپس کر دیا کہ ان میں سوائے ستائش اور مدح کے اور کچھ نہیں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بھی استمدادِ زر میں تکلف نہ تھا مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں "سو دو سو میں میری پیاس نہیں بجھتی۔ تمھاری ہمت پر سو ہزار آفریں ہے"۔ منشی ہیرا سنگھ نے اکثر شراب مہیا کی۔ "قاضی القضات ولایت حسین صاحب نے تین سو روپیہ ایکبار بھیجے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں پچاس روپیہ ماہوار دیا کرتے تھے نواب غلام بابا سورتی نے گھڑی اور روپیہ بھیجا۔ جے پور سے ٹھاکر صاحب بھیجتے رہتے تھے۔ اور پھر یہ سب تو وہ فتوحات ہیں جن کا علم خود مرزا کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ کتنی کچھ ایسی ہوتی ہونگی جن کا اب پتہ نہیں چل سکتا۔ خواجہ غلام غوث بے خبر کو لکھتے ہیں" قبلہ کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے کہ کوئی ہمارا دوست جو غالب کہلاتا ہے وہ کیا کھاتا پیتا ہے اور کیونکر جیتا ہے۔ پنشن قدیم اکیس ماہ سے بند اور یہ سادہ دل فتوح جدید کا آرزو مند"

مصرعہ متذکرہ بالا میں " نہ ستائش کی تمنا" بھی محض برائے بیت ہے۔ نواب علاؤ الدین احمد خاں نے مرزا سے پتہ کے لئے محلہ کا نام دریافت کیا۔ فرماتے ہیں" قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں ایک شخص ہے (یعنی غالب) کہ اس کی عزت و نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت و محقق ہے۔

(بقیہ ص۱۷ کا) پھر ۱۸۶۰ء میں قصیدۂ سال نو جسکا پہلا شعر یہ ہے ؎

زسال نو دگر آئے برو ئے کار آمد ٭ ہزار و ہشت صد و شصت در شمار آمد

لارڈ کیننگ کی مدح میں لکھ کر پیش کیا لیکن وہ بھی مع اس حکم کے واپس آیا کہ اب یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو (غالب نامہ صفحہ ۸۶)۔

اور تم صاحب بھی جانتے ہو۔ مگر جب تک اس سے قطع نظر نہ کرلو اور اس
مسخرے کو گمنام اور ذلیل نہ سمجھ لو تم کو چین نہ آئیگا"[51] یا پھر کوین پوئیٹ،
مقرر ہونے کے لئے اس قدر تگ و دو[52] نہ کرتے دراں حالیکہ گو نام کو ہی سہی
ابھی دلی کے قلعے کا دربار قائم تھا۔ اصل یہ ہے کہ لفٹننٹ گورنر بہادر کا
دربار اور خلعت ان کو دلی سے بھی زیادہ عزیز تھا۔[53]

مرزا کی اسلام دوستی اور وطن پرستی کا بھی یہی حال ہے۔ اپنی خلعت
کی عذر داری میں انھوں نے ایک قصیدہ سر جان میکلوڈ فنانشل کمشنر پنجاب
کی خدمت میں پیش کیا اس کا ایک شعر یہ ہے ؎

ہے یہ دعا کہ زیرِ نگیں آپ کے رہے ٭ اقلیم ہند و سند سے تا ملک روم و شام

یا جب سر سید علیہ الرحمۃ نے آئین اکبری کی تصحیح کر کے اس کے چھاپنے کا
ارادہ کیا اور غالب سے تقریظ لکھنے کی خواہش ظاہر کی تو تقریظ لکھنے میں
غالب نے اس قدر انگریز پرستی کا ثبوت دیا کہ سر سید جیسے انگریز پرست
کے گلے سے بھی وہ تقریظ نہ اتر سکی اور انھوں نے اس کو داخلِ کتاب نہیں
کیا[54] یا پھر یہ حقیقت کہ جب انگریزوں کا یہ فیصلہ معلوم ہوا کہ وہ ابو ظفر بہادر شاہ
کے بعد مغلی دربار کو قائم نہ رہنے دیں گے اور ولی عہد "بادشاہ" کا لقب

---

۵۱ ادبی خطوط غالب صفحہ ۴۴

۵۲ غالب نامہ صفحہ ۱۴۸

۵۳ ادبی خطوط غالب صفحہ ۴۴

۵۴ غالب نامہ صفحہ ۱۴۹

اختیار نہ کر سکے گا اور بجائے دلّی کے اس کو مہرولی میں رہنا ہوگا تو غالب نے اپنے ولی نعمت کے اس زوال پر آنسو بہانے کی بجائے جھٹ دوسرا ٹھکانا مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ بادشاہ سلامت بیمار ہوئے تو مرزا غالب نے منشی ہیرا سنگھ کو خط میں لکھا "از شب عید خاقان رنجور است و حالا دیگر چہ روشاید و من کہ در سایۂ دیوارش غنودہ ام چہ رود" اور ادھر فرماں روائے انگلستان ملکہ وکٹوریا کی تعریف میں ایک فارسی قصیدہ لکھ کر لارڈ کیننگ کی معرفت ولایت بھجوایا۔ اور اس کے ساتھ ایک عرضداشت بھی تھی کہ روم وایران کے بادشاہ شعراء پر بڑی بڑی عنایتیں کرتے ہیں اگر شاہنشاہ انگلستان مجھے خطاب دے اور خلعت اور پنشن سے سرفراز کرے تو عجب نہ ہو[۵۱]۔ غدر کے متعلق فرماتے ہیں "انگریزوں کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے کوئی میرا امیدگاہ تھا اور کوئی میرا شفیق ہے" پھر جب انگریزوں نے دوبارہ دلی فتح کر لی تو مرزا غالب نے مبارکباد کا قصیدہ لکھا[۵۲] اور اپنے گھر میں چراغاں کیا[۵۳]

یا مثلاً یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مرزا غالب کو اپنی بیوی سے کمال محبت تھی اور دیگر متعلقین سے ان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ افسوس کہ واقعات یہاں بھی کچھ اور کہانی سناتے ہیں۔ مرزا غالب کے

---

۵۱ غالب نامہ صفحہ ۷۲

۵۲ 〃 〃 ۸۸

۵۳ غالب از مہر صفحہ ۲۰۱

چچا نصراللہ بیگ کی شادی نواب احمدبخش کی بہن سے ہوئی تھی۔ نصراللہ بیگ نواب احمدبخش کی معیت ہی میں لڑائی میں کام بھی آئے تھے۔ اسی لئے نواب موصوف کو ان کے پسماندگان کا بہت خیال تھا یہی وجہ تھی کہ وہ غالب اور ان کے چھوٹے بھائی یوسف مرزا کو کم عمری ہی میں دلّی لے آئے۔ اور غالب کی شادی تیرہ برس کی عمر ہی میں اپنے بھائی نواب الٰہی بخش معروف کی چھوٹی لڑکی سے کر دی۔ اس کے کچھ ہی مدت بعد غالب مستقلاً دلّی میں آبسے۔ اور پھر ایک بار بھی کبھی اکبرآباد نہ گئے۔ اکبرآباد میں وہ اپنی ننہیال کی خوش حالی کی وجہ سے بہت آرام سے رہتے تھے۔ دلّی میں بھی شروع میں اس آرام میں فرق نہ آیا ہوگا۔ ورنہ کیوں مستقل طور پر یہاں رہنا گوارہ کرتے۔ غرضکہ اس میں شک نہیں کہ دلّی کے اس تعلق سے غالب کو بے اندازہ فائدہ پہنچا۔ آرام و آسائش۔ روپیہ پیسہ۔ گھر بار سرپرستی۔ تربیت۔ شاعری میں صحیح رہنمائی اور پھر شہرت سب اس دلّی کے تعلق ہی کی بدولت ان کو میسر آئی۔ شیخ محمد اکرام صاحب فرماتے ہیں "لیکن جب مرزا دلّی آئے اور مولانا فضل حق اور دوسرے مسلّمہ استادوں نے انھیں ان کے اشعار کے حسن و قبح سے آگاہ کیا تو مرزا کو ان کے علم و فضل کے آگے سر جھکانا پڑا اور اس طرح اپنی شاعری کا رخ بدلا [۹]" ورنہ اس میں شک نہیں کہ بقول میر مرزا غالب مہمل ہی بکتے رہتے۔ اس سب کے باوجود بیوی اور سسرال والوں کو انھوں نے کچھ

۹؎ غالب نامہ صفحہ ۲۷

اچھی طرح یاد نہیں کیا۔ بلکہ ہمیشہ دلی کو حراست اور بیوی کو بیڑی کہا جس کے کٹنے کی دعا مانگنے سے وہ کبھی نہ چوکتے تھے۔ مرزا تفتہ کے نام کے خط میں فرماتے ہیں :- " امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں۔ اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندہ گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندہ ٹوٹتا ہے نہ دم نکلتا ہے" میر مجروح کے نام کے خط میں لکھتے ہیں :-

" وبا تھی کہاں جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ۔ ایک چھیاسٹھ برس کا مرد اور ایک چونسٹھ برس کی عورت ان دونوں میں سے کوئی مرتا تو ہم جانتے کہ ہاں وبا آئی۔ تف بریں وبا"

تبدیلئ مکان کے سلسلے میں ایک نیا مکان دیکھا۔ مردانہ حصہ پسند آیا۔ زنانہ حصہ دیکھنے کے لئے بیگم کو بھیجا۔ واپس آکر انھوں نے کہا لوگ اس مکان میں بلا بتاتے ہیں۔ فرمایا " کیا تم سے زیادہ کوئی اور بھی بلا ہے[۱]"

ایک جگہ فرماتے ہیں :-

" بھائی میرا ذکر سنو۔ ہر شخص کو غم موافق اس کی طبیعت کے ہوتا ہے۔ ایک تنہائی سے نفور ہے ایک کو تنہائی منظور ہے۔ تاہل میری موت ہے۔ میں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔"

---

[۱] غالب کی شوخیاں صفحہ ۱۴۸

امراؤ سنگھ کی بیوی کے تعزیت کے خط میں حکیم سنائی کے حدیقہ میں سے اوحدی کرمانی کا یہ قطعہ بھی نقل کیا ہے

پسرے با پدر بہ زاری گفت ؎ کہ مرا یار شو بہ بہرہ جفت
گفت بابا زنا مکن و زن نے ؎ پند از خلق گیر و از من نے
در زنا گر بگیردت عسسے ؎ بہلا کو گرفت چوں تو بسے
زن کنی ہر گزت رہا نہ کند ؎ ور تو بگذاریش چہا نہ کند

مرزا حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں :-

"میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے اور اس نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے اس تصور سے جی گھبراتا ہے۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔"

یہی نہیں کہ نجی طریقہ پر وہ اپنی "تاہل" کی زندگی کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار جب اور جہاں موقعہ ملتا کرتے رہتے تھے۔ بلکہ وہ اس سے اس قدر دل برداشتہ تھے کہ شاعری میں بھی اکثر جگہ اس زندگی کی تلخی رونما ہو جاتی تھی۔ سبد چین میں فرماتے ہیں :-

گیر کہ در روز حشر چوں تو بیفتی ؎ بر سر دوزخ نہند تیرہ نشیمن
لیک نہ باشد دران مضیق مصیبت ؎ در طلب نان و جامہ کشمکش از زن
لیک نہ باشد دران مقام صعوبت ؎ شور تقاضائے نارسائے مہاجن

ایک رباعی میں فرماتے ہیں :-

اے آنکہ برائے کعبہ رغبتے داری ۔۔ دانم کہ گزیدہ آرزوئے داری
زین گونہ کہ تند مے خرامی دانم ۔۔ در خانہ زن ستیزہ خوئے داری

ایک اور رباعی سنئے :-

آن مرد کہ زن گرفت دانا نہ بود ۔۔ از غصہ فراغتش ہمانا نہ بود
دارد بجہاں خانہ و زن نیست درو ۔۔ نازم بخدا چرا توانا نہ بود

ایک قطعہ ملاحظہ فرمائیے :-

بہ آدم زن بہ شیطاں طوق لعنت ۔۔ سپردند از رہ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوق آدم ۔۔ گراں تر آمد از طوق عزازیل

پھر یہ محض زبانی واویلا نہ تھا۔ بلکہ اس بیڑی کو کاٹنے کی انھوں نے کوشش بھی کی یہ تصفیہ کیا کہ بیوی کو لوہارو بھیجا جائے اور خود آزادانہ زیست بسر ہو۔ اسکے یہی الفاظ تھے سنئے جو انھوں نے نواب علاؤالدین احمد خاں کو ایک خط میں لکھے :-

" تمھارے والد ماجد اور تمھاری جدہ ماجدہ سے اور تمھارے عم عالی مقدار سے کہہ چکا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ میرے بیوی بچوں کو کہ یہ تمھارے ہیں مجھ سے لے لو کہ میں اب اس بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا میرا قصد سیاحت کا ہے۔ پنشن اگر کھل گئی تو وہ اپنے صرف میں لایا کروں گا "

غالب کی بیوی بھی مجبوراً اس پر راضی ہو گئی تھیں۔ لیکن پھر کسی وجہ سے یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔

غرضکہ یہ تھے مرزا غالب کے تعلقات اپنی بیوی کے ساتھ ۔ یوں طبعاً بھی دونوں ایک دوسرے سے کوسوں دور تھے ۔ یہ شاعر آزاد منش۔

ستم پیشہ ڈومنی اور شراب سے دل بہلانے والے۔ وہ خشک، مذہبی متشرع اور پرہیزگار۔ یہاں تک کہ انھوں نے غالب کے کھانے کے برتن تک الگ کر رکھے تھے۔ پھر یہ اختلاف "جوانی دیوانی" کے زمانے ہی میں نہ تھا بلکہ آخر عمر تک بھی جب کہ شاید میاں بیوی کی نا اتفاقی کا امکان ہی نہیں رہتا اور ایک دوسرے کا خواہ مخواہ پرستار ہو جاتا ہے۔ اس وقت بھی غالب بیوی سے اتنے ہی عاجز تھے جتنے کہ شروع میں۔ اس بحث سے یہ مطلب نہیں کہ مرزا غالب اپنی بیوی کے ساتھ ناروا سلوک کرتے تھے یا اپنی ذمہ داری سے بے خبر تھے۔ لیکن فرض کی ادائیگی اور دل کی محبت میں جو فرق ہے وہ ایسا باریک نہیں کہ آسانی سے سمجھ میں نہ آجائے۔ پھر ان حالات میں صرف اس بنیاد پر کہ غالب نے ایک بار رام پور سے حکیم ظہیر الدین کو خط لکھا کہ وہ بیگم سے دریافت کر لیں کہ نواب شہاب الدین خاں نے ماہانہ (پچاس روپیہ) دے دیا یا نہیں۔ یا یہ کہ وہ دن کا کھانا گھر کے اندر جا کر بھی کھاتے تھے۔ یا جب دلی سے باہر جاتے تھے تو گھر کی خبر گیری کے لئے دو چار بار رائے چھجمل یا حکیم غلام نجف خاں کو لکھا یہ "ثابت" کر دینا کہ مرزا غالب کو "بیگم صاحبہ سے محبت تھی"[۹] خبر نہیں کیسا استدلال ہے۔ یوں دیکھئے تو بیوی سے دل نہ ملنا بھی کوئی جرم یا گناہ نہیں۔ لیکن چونکہ بیوی سے محبت کرنا مستحسن چیز ہے اس لئے سوچا کہ یہی کیوں نہ "ثابت" کر دیا جائے کہ مرزا غالب کو

---

[۹] غالب از مہر صفحہ ۴۷۔

بیوی سے کمال محبت تھی۔

بیوی کے علاوہ اور سب متعلقین سبھی سے بھی ان کے تعلقات ایسے ہی بیزاری کے تھے بسسرال میں پڑے ہوئے تھے۔ لیکن ہمیشہ سب سے دل برداشتہ۔ ان کے خسر نواب الٰہی بخش خان معروف بڑے متقی بزرگ تھے۔ ایک بار نواب موصوف نے غالب کو شجرہ نقل کرنے کو دیا۔ غالب نے دانستہ اس کو غلط سلط نقل کر دیا۔ کہ پھر بے چارے نواب کو کسی کام کو کہنے کی جرأت نہ ہوئی[۱۵] مرزا کے تعلقات اپنے برادر نسبتی مرزا علی بخش رنجور سے گو شروع میں خراب نہ تھے۔ لیکن آگے چل کر ان سے بھی دل گرفتہ ہو گئے تھے۔ لکھتے ہیں :-

"سبحان اللہ، گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانا اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں۔ ہاں صاحب گولہ انداز (مرزا معین الدین) کا بہنوئی (نواب ضیاء الدین احمد) مددگار ہے اور شاعر (غالب) کا سالا (مرزا علی بخش) بھی جانبدار نہیں"

مختصر یہ کہ وہ سب ہی سے خلاف اور خفا تھے۔ نواب انوار الدولہ کالپی کو خط میں لکھتے ہیں :-

"میرا اہم قوم تو سراسر قلمرو ہند میں نہیں۔ سمرقند میں دو چار یا دشت قبچاق میں سو دو سو ہوں گے۔ مگر اقربائے سبھی ہیں۔ سو پانچ برس کی عمر سے ان کے دام میں اسیر ہوں۔ اکسٹھ برس ستم اٹھائے[۱۵]

---

[۱۵] غالب از مہر صفحہ ۲۷۶

گر وہم شرح ستم ہائے عزیزان غالب   رسم امید ہمانا زجہاں برخیزد"

اصل میں وہ انتہائی خود غرض اور خود پسند آدمی تھے۔" اور تو اور انھوں نے اپنے بھائی مرزا یوسف اور ان کے اہل و عیال کی غدر اور اس کے بعد کوئی خاص مدد نہ کی۔ غدر کی مصیبتیں مرزا یوسف کو تن تنہا جھیلنی پڑیں اور جب وہ مر گیا تو معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نماز جنازہ میں بھی شریک نہ تھے۔ اس کی وفات کے بعد مرزا نے اپنی بھتیجی اور بھاوج وغیرہ کے لئے کیا کیا اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ لیکن ان کے ایک اردو خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم تین سال تک اپنی بھتیجی کو ایک پائی نہ بھیجی (حالانکہ مرزا کی اپنی بسر اوقات پنشن پر تھی) بے شک یہ غیر معمولی وقت تھا اور مرزا اپنی مصیبتوں میں گرفتار تھے۔ لیکن ان حالات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہی خیال ہوتا ہے کہ ان کی اپنی ضرورتیں اتنی بڑھی ہوئی تھیں کہ وہ کسی کی خاطر اپنے آرام کو قربان نہیں کرتے تھے۔ اور نہ اپنے تئیں خطرے میں ڈالتے تھے۔[۵] مرزا حاتم علی مہر کے نام کے خط میں انھوں نے اپنے نقطہ نظر کی خود اس طرح ترجمانی فرمائی ہے :-

"شباب میں ایک مرشد کامل نے نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو کھاؤ مزے اڑاؤ۔ مگر یاد رہے مصری کی مکھی بنو۔ شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس پر عمل رہا ہے۔"

اخلاق کا یہ عالم کہ ولیم فریزر کے قتل کے معاملے میں نواب شمس الدین خاں

۵؎ غالب نامہ صفحہ ۱۵۶، ۱۵۷

واسطے فیروزپور کی بوجہ دشمنی چغلی کھائی[۵] اور نواب موصوف کو پھانسی ہوئی - یہ مانا کہ غالباً اس قتل میں نواب موصوف کا ہاتھ تھا لیکن پھر بھی غالب کا یہ فعل اپنی جگہ کسی طرح بھی مستحسن نہ تھا - غالب کے ابن الوقتی کے بھی خاصے دلچسپ مظاہرے نظر آتے ہیں - برہان قاطع والے قضیہ میں غالب کی کوشش تھی کہ مخالفین کے جوابات خود لکھیں اور دوستوں کے نام سے چھپوائیں - یا کم از کم کوئی ان کا جاننے والا ان کے خلاف نہ لکھے - اس حالت میں سنا کہ خواجہ غلام غوث بے خبر ان کے خلاف کچھ لکھنے والے ہیں - پھر جب اطمینان ہو گیا کہ ایسا نہیں ہے تو انھیں نہایت نیازمندانہ خط لکھا - لکھتے ہیں :-

" بلا مبالغہ کہتا ہوں ستر ہزار آدمی نظر سے گزرے ہوں گے زمرہ خواص میں سے - عوام کا شمار نہیں - دو مخلص صادق الولا دیکھے - ایک مولوی سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ دوسرا منشی غلام غوث بے خبر سلمہ اللہ تعالیٰ "

ادھر مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں :-

" مجھے اس پر ناز ہے کہ میں ہندوستان میں ایک دوست صادق الولا رکھتا ہوں جس کا ہر گوپال نام اور تفتہ تخلص ہے "

اسی طرح قدر بلگرامی کو لکھا کہ محرق کا جواب اپنے نام سے چھپوا دو لکھ میں دونگا - اور پھر اس ارادے سے کہ قدر پر اچھا اثر پڑے اور شیعیت

---

[۵] غالب از مہر صفحہ ۴۳

کا اشتراک ہمدردی پر آمادہ کر ہی دے خط کے خاتمہ پر اپنے نام کے بعد "اثنا عشری حیدری" خصوصیت کے ساتھ لکھا[۹۱]۔ سچ ہے ۔ غالب

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال ؎ رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

اخلاق و عادات تو الگ رہے، ان کی بذلہ سنجی اور ذکاوت کی شگفتہ مثالیں جو یادگار کے ذریعہ ہم تک پہنچی تھی بعض بعض وہ بھی غلط ثابت ہو رہی ہیں۔ مثلاً یادگار میں ہے کہ کسی نے کہا کہ واحد متکلم کے 'آپ' کا لفظ 'تئیں' سے فصیح تر ہے۔ غالب نے کہا کہ اس میں یہ قباحت ہے کہ اگر بالفرض مجھے براہ خاکساری اپنے تئیں احمق کہنا ہو تو میں کہوں گا کہ "میں آپ کو احمق سمجھتا ہوں" اور مشکل یہ ہو گی کہ آپ اپنے لئے سمجھیں گے لیکن ادبی خطوط غالب میں غالب کا ایک خط یوں شروع ہوتا ہے:۔

"تئیں کا لفظ متروک مردود و قبیح و غیر فصیح۔ یہ پنجاب کی بولی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے لڑکپن میں ایک اصیل ہمارے ان نوکر رہی تھی۔ وہ تئیں بولتی تھی تو بیبیاں اور لونڈیاں سب اس پر ہنستی تھیں[۹۲]"

اسی طرح رتھ کا لطیفہ کہ کسی نے غالب سے پوچھا رتھ مذکر ہے یا مؤنث۔ فرمایا اگر اس میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مؤنث اور اگر مرد تو مذکر۔ لیکن میر مجروح کے نام کے خط میں لکھتے ہیں:۔

"رتھ میرے نزدیک مذکر ہے[۹۳]"

---

۹۱ ادبی خطوط غالب صفحہ ۲۱۵

۹۲ " " " " ۲۱۶

۹۳ " " " " ۱۹۷

مختصر یہ کہ ان ژرف نگاہیوں اور موشگافیوں کی بدولت ہر وہ چیز نظروں کے سامنے آگئی جو نہ آنی چاہئے تھی۔ اور جسے ہماری عقل ہیرو سے نہیں بلکہ نہایت عام قسم کے انسانوں سے منسوب کرتی ہے۔ بلکہ بعض باتیں تو عام آدمی سے بھی عموماً سرزد نہیں ہوتیں۔ مثلاً ان کی دریدہ دہنی کی ایک مثال ملاحظہ ہو:۔

"بھائی شہاب الدین خاں واسطے خدا کے یہ تم نے اور حکیم نجف خاں نے میرے دیوان کا کیا حال کر دیا ہے۔ یہ اشعار جو تم نے بھیجے ہیں خدا جانے کس ولدالزنا نے داخل کر دیئے ہیں۔ دیوان تو چھاپے کا ہے متن میں اگر یہ شعر ہوں تو میرے اور اگر حاشیہ پر ہوں تو میرے نہیں۔ بالفرض اگر یہ شعر متن میں پائے بھی جائیں تو یوں سمجھنا چاہئے کہ کسی ملعون۔ زن جلب نے اصل کلام کو چھیل کر یہ خرافات لکھ دئے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جس مفسد کے یہ شعر ہیں اس کے باپ پر اور دادا پر اور پردادا پر لعنت اور وہ ہفتاد پشت تک ولدالحرام۔ اس کے سوا اور کیا لکھوں ۔[سلہ ۵۱]"

نئی تحقیقات کے سلسلے میں چند ایسی بھی باتیں منظر عام پر آگئی ہیں جن پر اب پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ اور جن کو انصاف بالائے طاعت کے اصول پر پرکھنا لازم ہو گیا ہے۔

القصہ یہ ہے اس مکروہات کا طومار جو غالب کے متعلق "نئی تحقیق" کا نتیجہ ہے۔ اور چونکہ اب اس پر کسی طرح پردہ نہیں پڑ سکتا اس لئے غالب کے پرستاروں نے اس سب خرافات کو اس دلیل اور اس وجہ سے ماننا اور

سلہ ۵۱ ادبی خطوط غالب صفحہ ۲۴۷

منوانا شروع کر دیا ہے کہ یہ سب گفتۂ غالب ہے اس لئے اس میں کلام کی گنجائش نہیں - مولانا غلام رسول صاحب مہر- بی- اے کی تازہ تصنیف 'غالب' بھی اسی تعمیل کی ایک کوشش ہے - اس کی زبان پاکیزہ اور تفصیلات بسیط لیکن افسوس کہ حالات و واقعات پر صحیح تبصرہ و تنقید نہیں ہے - بلکہ ہر جگہ اور ہر بات میں صرف غالب کا پلّہ بھاری رکھنے کے علاوہ اور کوئی خاص کوشش تحقیق حق میں نہیں کی گئی ہے- نہ متضاد باتوں کا صحیح موازنہ کر کے حکم لگایا گیا ہے نہ ادعائے غالب کو سمجھا لے اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے- بلکہ جہاں اس قسم کا کوئی معاملہ آ بھی گیا ہے تو مہر صاحب نے بھی مخالف کی تضحیک فرمائی ہے تردید کی کوشش بھی نہیں کی ہے- مثلاً شاہزادہ جواں بخت کے سہرے کے سلسلے میں جو بدمزگی سی غالب اور ذوق کے درمیان رونما ہو گئی تھی- اس سلسلے میں کوئی کوشش اس قسم کی نہیں کی گئی ہے کہ اگر واقعی ذوق کا سہرا مقابلتاً کمزور تھا تو ان کمزوریوں کو دکھائیں - بلکہ محض اس پر اکتفا کیا گیا ہے کہ حقارت سے ذوق کا ذکر کر دیا جائے - فرماتے ہیں۔ "ذوق کی غلط فہمی اور غلط اندیشی کے باعث جو صورت حالات پیدا ہو گئی تھی اس پر غالب نے ایک فارسی قطعہ بھی ذوق کو مخاطب کر کے لکھا تھا- اس میں فرماتے ہیں:-

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ — بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگِ من است

راست می گویم و از سرِ راستی نتواں کشید — ہر چہ در گفتار فخرِ تست آں ننگِ من است"[1]

---

[1] غالب از مہر صفحہ ۲۳۵

یا پھر کورانہ تعریف و توصیف کا ایک لطیفہ سنئے ۔ آج تک بھی اُردو کتب کا طبع و شائع کرانا عام طور پر کچھ منفعت بخش مشغلہ نہیں ہے۔ بلکہ ناشرین کتب سے اگر واقعی دریافت کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شاید ہی سینکڑوں میں کوئی ایسی کتاب نکلتی ہے جس میں لاگت وصول ہو جاتی ہے۔ اسی لئے مطبع والے کسی کتاب کو اپنے خرچ پر چھاپنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ غالب کے زمانے میں تو حالت اور بھی سنگین ہوگی۔ وہ تو یوں کہئے کہ غالب ہی کی کتابیں تھیں کہ مطبع والے عام طور پر اس شرط پہ چھاپنے پر تیار ہو جاتے تھے کہ مرزا کتاب چھپنے کے بعد ایک معین تعداد نسخے خریدیں۔ غالب اپنی جگہ اس کا یہ انتظام کرتے تھے کہ کبھی نواب صاحب رام پور سے اس کے لئے روپیہ لے لیتے تھے[۹۱] کبھی نواب میر غلام بابا سے[۹۲] کلیات فارسی کی طباعت پر نواب علاؤالدین نے دس جلدیں خریدیں۔ بعض دفعہ مطبع والے بغیر کسی شرط کے بھی کوئی سی کتاب چھاپ دیتے تھے مثلاً غالب کا اُردو دیوان۔ غرضکہ یہ آپس کا انتظام تھا دستنبو کی طباعت کے سلسلے میں شرط یہ تھی کہ غالب پچاس نسخے خریدینگے یہ شرط رائے امید سنگھ صاحب اندور والے نے پوری کردی اور پچاس نسخے خرید کر پچیس خود رکھے اور پچیس غالب کی نذر کردئے۔ اب اس کے بعد غالب نے سولہ نسخے وقتاً فوقتاً اور خریدے جن کے متعلق انھوں نے

---

۹۱ اُردوئے معلی صفحہ ۱۱۳

۹۲ " " " ۱۷ و ۲۳

ایک خط میں لکھا ہے کہ :-

"سولہ جلدیں اور لے چکا ہوں مگر نقد ۔ قرض میں نے نہیں منگوائیں"

بس اس بات کو مہر صاحب لے اڑے ۔ ایک عنوان قائم کیا کہ "احسان لینا گوارا نہ تھا" اور اس رقعہ کی بنا پر یہ "ثابت" کر دیا کہ غالب کسی کا ذرا سا بھی احسان نہیں لیتے تھے[۹] گویا رائے امید سنگھ صاحب سے جو چھبیس جلدیں لی تھیں، وہ قرضہ وصول کیا تھا ۔ اور پھر یہ تو اس پہ عالت ہے کہ غالب کی قصیدہ خوانی اور فتوحات کی وہ تمام تفصیلات جو ہم نے شروع کے صفحوں پر دی ہیں وہ بھی مہر صاحب کی اسی کتاب سے لی گئی ہیں ۔ مہر صاحب نے اور عنوانات بھی قائم کئے ہیں مثلاً "انکسار" ! یا "مخالفت سے عفو اور درگذر" !

اصل میں "انصاف بالائے طاعت" کے اصول پر تو اب تک محض دو کتابیں لکھی گئی ہیں ایک "غالب" از ڈاکٹر سید عبد اللطیف صاحب اور دوسری 'غالب نامہ' از شیخ محمد اکرام صاحب ۔ ڈاکٹر صاحب کی کتاب گو بعض جگہ ذرا کڑی بلکہ کڑ وی ہو گئی ہے ۔ لیکن انھوں نے اصول نقد و تبصرہ کا نہایت اچھا اسلوب پیش کیا ہے ۔ شیخ صاحب کی کتاب کو اصل میں ڈاکٹر صاحب کی کتاب کا تتمہ سمجھنا چاہئے ۔ شیخ صاحب نے اس خاکے میں رنگ بھرے ہیں جو ڈاکٹر صاحب نے تیار کیا تھا بلکہ خود خاکے کو بھی اکثر جگہ سے درست کر دیا ہے ۔ افسوس ہے غالب نامہ

---

۹ ؎ غالب از مہر صفحہ ۲۶۲

کی زبان ایسی نہیں، جیسی کہ کسی ادبی کتاب کی زبان کو ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن اس کے علاوہ کتاب ساری کی ساری نہایت قابلِ قدر ہے۔

غالب اور قتیل دشمنی

ہم اپنے مقصد سے کچھ دور جا پڑے۔ اس فرصت میں ہمارا مطلب غالب کے سوانحِ حیات پر ایک عام بحث نہیں ہے۔ بلکہ اس معاملے اور جذبے کو خصوصیت کے ساتھ پرکھنا اور "انصاف بالائے طاعت" کے اصول پر کسنا ہے جس سے "ادبی خطوطِ غالب"[۹۱] کے صفحے کے صفحے پر ہیں۔ یعنی غالب کی قتیل دشمنی۔ مرزا غالب پر قتیل مرحوم کی مخالفت مرض کی حد تک مستولی تھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس افسوسناک قضیہ کا اصلیت میں بھی کوئی علمی یا ادبی مقصد یا سبب تھا یا یہ سب محض ذاتی عناد اور خدا واسطے کی دشمنی کے مظاہرے تھے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ اس سوال کا جواب حتی الامکان نیک نیتی اور انصاف سے آیندہ صفحوں میں نذرِ ناظرین کریں۔

غالب کا یہ معرکہ فارسی زباندانی کے متعلق تھا۔ یوں تو وہ عقل اور سمجھ، علم و ادب، ذہانت و ذکاوت، بذلہ سنجی اور ظرافت، شکل اور صورت[۹۲] حتیٰ کہ معرفتِ خدا اور تفہیمِ اصولِ مذہب[۹۳] تک میں اپنے کو سب سے بہتر و افضل

---

۹۱ مرتبہ جناب مرزا محمد عسکری صاحب بی۔ اے لکھنوی۔ انوار المطابع لکھنؤ

۹۲ مرزا حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں "تمھارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمھارے گندمی رنگ پر رشک نہیں آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ (باقی صفحہ ۴۵ پر)

سمجھتے تھے لیکن جس چیز کو وہ بلا شرکت غیرے اپنی ملکیت سمجھتے تھے اور جس کے وہ بزعم خود تنہا وارث تھے وہ فارسی زبان تھی۔ ہندوستان کے فارسی داں متقدمین ہوں یا متاخرین ان کی نظر میں انتہائی ہیچ و پوچ اور اور اس درجہ گئے گذرے تھے کہ ان کا نام لینا بھی مرزا کو گوارا نہ تھا۔ خودستائی اور غرور کا یہ عالم تھا کہ فرماتے ہیں ؎

ہر چند زمانہ مجمع جہاں است   در جہل نہ حال نشان بیک منوال است
کو دن ہمہ لیک از یکے دگرے   فرق خرے عیسیٰ وخر دجال است

ان کا یہ غلو شروع ہی سے تھا[۵۱] لیکن کوئی خاص موقعہ ایسا نہیں آیا تھا کہ ان کا یہ عقیدہ اوروں پر بھی پوری طرح ظاہر ہو۔ یا ان کو اپنی فضیلت جتانے اور منوانے کی ضرورت ہو۔ یہ صورت اس وقت پیدا ہوئی جب وہ اپنی پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں پہلی بار دلی سے نکلے اور کلکتے پہنچے اب ماحول نے غالب کو جتانا شروع کیا کہ نہ دنیا دلی اور آگرے پر ختم ہے نہ علم غالب پر۔ کلکتہ میں مرزا کو پہلی بار معترض کے نشتر کا مزا چکھنا پڑا اور یہی وجہ ان کے دل کی بات کو منظر عام پر لانے کا باعث ہوئی۔ اپنی فضیلت

(بقیہ صفحہ گذشتہ) اس کی ستائش کیا کرتے تھے"

۵۰ مولوی حمزہ خاں کو لکھا ہے "مولوی مشہور ہونا اور رسائل ابو حنیفہ کو دیکھنا اور مسائلِ حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے اور عرفا کے کلام سے حقیقتِ حقہ وحدتِ وجود کو اپنے دل نشین کرنا اور ہے .... میں موحدِ خالص اور مومن کامل ہوں"

۵۱ غالب نامہ صفحہ ۳۲

اور دوسروں کی ہیجدانی کو اجاگر کرنے کا اس سے اچھا اور کیا موقعہ ہو سکتا تھا۔ اس وقت سے غالب نے ہندوستان کے فارسی دانوں کی علانیہ تضحیک و تذلیل میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اور چونکہ غالب پر پہلا اعتراض مرزا قتیل مرحوم کی سند پر ہوا تھا اس لئے بے چارے قتیل کی تو وہ شامت آئی کہ خدا کی پناہ۔

غالب کا پس منظر | قبل اس کے کہ جناب کو اس آتش فشانی مادے سے آگاہ کیا جائے جو کلکتہ میں غالب پر اعتراض ہونے کے بعد بشکل سب و شتم وہاں غالب سے بہہ نکلا یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے پس منظر پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے کیونکہ میرا یہ خیال ہے کہ اگر مرزا غالب کی زندگی کی دوسری تلخیاں اور ناکامیاں ان کے دل و دماغ کو مشتعل اور اور ذکی الحس نہ کئے ہوئے ہوتیں تو ان کی طبیعت اس درجہ تلخ نہ ہو جاتی کہ ع کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی۔ اور نہ وہ محض ایک اعتراض پر اس قدر پھوٹ بہتے۔

غالب کی شروع کی زندگی بہت آرام و آسائش بلکہ ایک حد تک عیاشی میں گذری تھی۔ لیکن باپ اور چچا کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد حالات بہت تبدیل ہو گئے تھے۔ ان کے باپ اور چچا نواب احمد بخش کے ساتھ اس زمانے کے فوجی معرکوں میں شریک رہے تھے۔ اور غالباً نواب موصوف ہی کی کوششوں سے ان دونوں کی فوجی خدمات کے عوض الور اور کمپنی بہادر نے کچھ جاگیریں ان کے پسماندگان کے لئے دے دی تھیں غالب کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ کی شادی بھی نواب احمد بخش کی بہن سے

ہوئی تھی ۔ نواب کے اسی تعلق کی بنا پر مرزا غالب کی شادی تیرہ برس ہی کی عمر میں نواب موصوف کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش معروف کی لڑکی سے ہوئی بلکہ اتنی کم عمری میں شادی کر لینے اور ان کو خانہ داماد رکھنے کی وجہ ہی یہ تھی کہ نواب احمد بخش ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مسلوک ہونا چاہتے تھے ۔ دلی میں سسرال کی بدولت عموماً اور نواب احمد بخش اور الٰہی بخش معروف کے سلوک کی وجہ سے خصوصاً مرزا غالب کے شروع کے آٹھ دس برس بہت آرام سے گزر گئے ۔ لیکن نواب الٰہی بخش نے ۱۲۴۱ھ میں انتقال کیا اور نواب احمد بخش فیروزپور کی گدی اپنے بڑے بیٹے نواب شمس الدین احمد خاں کو سپرد کر کے الگ ہو بیٹھے ۔ پھر ۱۲۴۲ھ میں خود نواب احمد بخش کا بھی انتقال ہو گیا ۔ اس وقت سے غالب کی معاش میں واقعی بڑی کھنڈت پڑ گئی ۔ اور ان کو اس مد میں بے حد کشمکش اٹھانی پڑی ۔ گویا معاشی نقطہ نظر سے پہلی عیاشی اور بے غل و غش کے مقابلے میں اب صرف ساڑھے باسٹھ روپیہ ماہوار کی پنشن ان کے لئے فاقہ زدگی کے برابر تھی ۔ اور قرضخواہوں کے تقاضوں نے ان پر عرصۂ زیست تنگ کر دیا تھا ۔ نجی حالات بھی دل خوش کن نہ تھے ۔ گھر میں پے در پے سات بچے ہوئے اور سب ضائع ہو گئے[۵۱]

۵۱؎ اس کی وجہ زیادہ تر ان کے خون کی حدت معلوم ہوتی ہے جس کی وجہ سے انکی زندگی کے آخری کئی سال بے حد تکلیف اور صعوبت میں گذرے ۔ یہ خون کی حدت تحریک کچھ تو خاندانی تھی جس کے اثر سے ان کے بھائی تو بالکل ہی دیوانے ہو گئے اور کچھ شراب کی زیادتی سے شاید "ستم پیشہ ڈومنی" کے "عطیات" بھی اس میں شامل ہوں ۔ مسلسل سات بچوں کا رضاعت ہی میں ضائع ہونا شاید اس وجہ سے ہو۔

ادھر بھائی دیوانہ ہوگیا۔ سماج میں جوان کی حیثیت تھی وہ شاہان کو سب سے زیادہ دل برداشتہ اور آشفتہ خاطر کئے ہوئے تھی۔ قلعہ میں رسوخ کی بہت تمنا تھی اور اس کے لئے جس طرح بھی بن پڑا کوششیں بھی بہت کیں۔ لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ جس چیز نے ان کو آزردہ کر رکھا تھا وہ دلی والوں کی بقول غالب ان کے کلام کی ناقدری تھی۔ وہ پندرہ سولہ برس کی عمر میں مستقلاً دلی چلے آئے تھے۔ اور پچیس برس کی عمر تک اردو میں شعر کہتے رہے۔ لیکن ان دس سال میں کبھی کوئی قدر نہ ہوئی۔ بلکہ عموماً برسرِ مشاعرہ ان کے فارسی نما اردو کلام پر بے معنی، بے مزہ اور ناکارہ ہونے کے الزام لگائے جاتے تھے۔ اور تضحیکاً بے معنی الفاظ اور تراکیب کو جوڑ جوڑ کر گویا غالب کی طرز کی نقل کی جاتی تھی۔[۱] اس کے برخلاف بادشاہ، قلعے کے سینکڑوں شاہزادے اور شہر کے خاص و عام ذوق کی محاورہ بندی اور روزمرّہ کے بے انتہا مدّاح تھے مرزا اس چیز سے اس قدر محزون اور کبیدہ خاطر تھے کہ صلہ اور ستائش کے انتہا سے زیادہ خواہشمند ہونے کے باوجود انتہائی یاس سے فرمایا ہے

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا　　گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

ممنون، ذوق اور مومن وغیرہ کی شہرت اور قدر ان کو اور کھوئے دیتی تھی۔ یوں

---

[۱] ان میں عوام ہی نہیں بلکہ خواص تک شامل تھے حکیم آغا جان عیش کا مشہور قطعہ "مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے" یا مولانا فضل حق خیرآبادی کا بھینس کے انڈے والا شعر اسی ضمن کی چیزیں ہیں۔

وہ طبعاً بھی ایسے واقع ہوئے تھے کہ دنیا کو دیکھ دیکھ کر جلے جاتے تھے۔ اور خاص و عام کے حسد کے مارے مرے جاتے تھے۔ فرماتے ہیں ؎

غالب غمِ روزگار ناکامم کشت ٭ از تنگیِ دل بحلقۂ دامم کشت
ہم غیرتِ سربزرگیِ خاصم سوخت ٭ ہم رشکِ نشاط مندیِ عامم کشت

پچیس برس کی عمر کے بعد سے اسی کوفت کی باعث انھوں نے اردو میں شعر کہنا ہی چھوڑ دیا۔ اور اس کے بجائے فارسی شروع کی۔ فارسی میں دلّی میں ان کو واقعی امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ گو اس وقت بھی دلّی میں مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی صدر الدین آزردہ، حکیم مومن خاں، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مولانا صہبائی وغیرہ اصحاب موجود تھے۔ اور گو یہ سب اہلِ علم حضرات تھے جنھوں نے تحصیلِ علوم متفرق میں عمریں صرف کی تھیں لیکن فارسی محاورہ اور فارسی زبان دانی میں یقیناً غالب کے ہم پلہ نہ تھے۔ دلّی آنے کے بعد غالب نے فارسی شعرا کا غائر مطالعہ کیا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ مرزا کے کلام کی روایات کا سلسلہ حزیں۔ بیدل۔ ظہوری۔ عرفی۔ نظیری کے واسطے سے امیر خسرو تک پہنچا تھا۔ گو شروع انھوں نے بیدل کے رنگ سے کیا۔ لیکن "جب انھوں نے فارسی شاعری کا زیادہ مطالعہ کیا۔ اور شیخ علی حزیں نے مسکرا کر ان کی بے راہ روی ان کو جتائی اور طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا جو مادّہ تھا وہ فنا کر دیا۔ اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا سکھایا تو ان کے کلام میں ان شعراء کی خصوصیات آگئیں"[۱] مختصر یہ کہ اس وقت غالب فارسی دانی میں

---

[۱] غالب نامہ صفحہ ۲۸ و ۲۹

یقیناً دلّی میں یکتا تھے۔ اور اس کا احساس ان جیسے خود پرست آدمی کو کما حقہٗ تھا وہم چو من دیگرے نیست کا مجسمہ تھے۔ اور پھر اس میں اس قدر تفاخر و تمرّد کہ مبدا فیض کے علاوہ کسی کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنا ہتک سمجھتے تھے۔ ملا عبدالصمد (ہرمزد) کی شاگردی کو باعث عار سمجھا اور اکثر اس سے انکار کیا۔[۵۱] القصہ غالب کا معاشی نجی اور سماجی ماحول اس وقت نہایت ہی یاس انگیز اور تاریک تھا۔ چاروں طرف سے مجبوریوں نے گھیر رکھا تھا۔ ایک لے دے کر فارسی دانی رہ گئی تھی جس کو وہ اصل زندگی اور حاصلِ زندگی سمجھے ہوئے تھے۔ ان حالات میں پنشن کے مقدمے کے لئے ان کو دلّی چھوڑنی پڑی۔ دلی سے کلکتہ تک سفر کے حالات بھی خلافِ طبیعت اور خلافِ امید ہوتے گئے۔ اور ان کی ناکامیوں نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ راستہ میں بڑی امیدوں اور الطافِ کرم کی کششوں کے ساتھ لکھنؤ گئے۔ یہاں نائب السلطنت معتمد الدولہ آغا میر کا زمانہ تھا۔ مرزا قتیل کی وفات کو آٹھ نو برس ہو چکے تھے۔ لیکن قتیل کی شہرت اور عزت اس شہر میں ایسی تھی آٹھ نو سال کیا اسّی نوّے سال کا بُعد بھی اس میں کوئی کمی پیدا نہ کرتا۔ غالب کے متوسلین ناسخ وغیرہ بھی قتیل کے دوست اور مداح تھے[۵۲] خود معتمد الدولہ بھی قتیل مرحوم کے معتقدین میں سے تھا۔ پھر

---

۵۱ یادگارِ غالب صفحہ ۱۱

۵۲ ناسخ کے تعلقات مرزا قتیل سے خاص تھے۔ مرزا قتیل نے اس طرح اپنے رقعات میں ناسخ کا ذکر کیا ہے:۔ "لال بیگ رقعۂ در جوابی تو تحریر من کہ (باقی صفحہ ۴۱ پر)

اس وقت کے لکھنؤ میں دلی کی بہ نسبت فارسی کا زیادہ چرچا تھا جس کا خود غالب کو اعتراف تھا۔ اس کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ اودھ سلطنت کی زر ریزی اور زر پاشی کی وجہ سے اکثر ہندی اہلِ کمال وہاں چلے گئے تھے بلکہ سلطنت کے سرکاری مذہب کی وجہ سے ایرانی علما اور ادبا کا بھی وہاں "تانتا بندھا ہوا تھا۔ جو اکثر وہیں رہ جاتے تھے۔ لیکن اس شہر میں غالب کی کوئی قدر نہ ہوئی۔ بادشاہ تو بادشاہ نائب السلطنت سے بھی ملاقات نہ ہو سکی گو وہ اس امید میں بقول صاحبِ غالب نامہ گیارہ ماہ کے قریب لکھنؤ پڑے رہے۔ غالب کی حساس طبیعت اس چیز کو نظر انداز نہ کر سکتی تھی کہ جس شہر میں قتیل نے اقلیم سخن کی بادشاہی کی ہو اور جس میں اب مرنے کے بعد بھی اس کی یہ عظمت اور وقعت ہو وہاں غالب کی مطلق نہ چلے۔ اس چیز نے غالب کو غیر شعوری طور پر متاثر کیا ہوگا۔ اور گویا قتیل کی مخالفت کی بنیاد یہاں رکھی گئی ہوگی۔ لکھنؤ سے چلے تو یہاں سے کلکتہ تک وہ علاقہ تھا جہاں فارسی داں زیادہ تر قتیل کے شاگرد یا مداح تھے۔ غرضکہ ان سب خلاف طبع باتوں نے رہا سہا ضبط اور توازن بھی کھو دیا۔ اور ان کا چڑچڑاپن اور تُرشی کر گیا۔ کریلا اور نیم چڑھا۔ چنانچہ اس طرح "از بیدادِ روزگار نالاں و سینہ بہ دم تیغ مالاں بہ کلکتہ رسیدم"[۱] کلکتہ کا قیام بھی

(بقیہ صفحہ گذشتہ) برائے ورود بعضے روشناں بجائی نشیم رسانید۔ آں دقت شیخ امام بخش ناسخ و میر سعادت علی نیز مرزا حاجی صاحب و آقا صاحبان محرم نشستہ بودند" رقعہ نمبر ۱۸۱ اس کی علاوہ ناسخ کا تمامتر عروج مرزا حاجی قمر کے زیر سایہ ہوا۔ اور یہ مرزا حاجی قمر قتیل کے شاگرد تھے۔

[۱] بنام مولوی محمد علی صدر امین باندہ۔ یادگار غالب صفحہ ۱۵

بے فائدہ اور فضول ثابت ہوا۔ کیونکہ جس مقصد سے گئے تھے اس میں قطعی ناکامی ہوئی۔ حکام بالا دست کا فیصلہ ہوا کہ یہاں کوشش کرنی بیکار ہے دلی کے ریذیڈنٹ کے ذریعہ اور واسطے سے یہ مقدمہ یہاں آنا چاہئے۔ غرضکہ ان سب چیزوں نے مل کر غالب کو غیر معمولی طور پر ذکی الحس بنا دیا تھا۔ اب لے دے کر ان کی وہی فارسی دانی رہ گئی تھی جس پر ان کا ایمان تھا۔ لیکن قدرت کو کچھ یہ منظور تھا کہ اس میں بھی شکوک پیدا ہو جائیں۔

غالب پر اعتراض

"کلکتہ میں ان دنوں مدرسہ کلکتہ کے زیر اہتمام ہر ماہ ایک بزم مشاعرہ منعقد ہوا کرتی تھی۔ جب مرزا وہاں پہنچے تو ان کے اعزاز میں ایک خاص مشاعرہ ہوا۔ پانچ ہزار کا مجمع تھا اس میں غالب نے اپنی وہ غزل پڑھی جس کا یہ مقطع بہت مشہور ہے ؎

گر وہم شرح ستم ہائے عزیزاں غالب ✽ رسم امید ہما نا ز جہاں برخیزد

جب اس شعر پر پہنچے ؎

جزوے از عالم و از ہمہ عالم بیشم ✽ ہمچو موئے کہ بتاں را ز میاں برخیزد

تو حاضرین میں سے کسی نے اعتراض کیا کہ ہمہ عالم کی ترکیب غلط ہے۔ عالم مفرد ہے اسکا ربط ہمہ کے ساتھ بہ حسب اجتہاد قتیل ممنوع ہے۔[۱]" اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ذیل کے شعر پر بھی اعتراض ہوا کہ زدہ کا استعمال غلط ہے ؎

شور اشکے بفشار بن مژگاں دارم ✽ طعنہ بر بے سرو سامانی طوفان زدہ

غالب کے معترضین میں مولوی عبدالقادر رام پوری، مولوی کرم حسین بلگرامی،

۱؎ ذکرِ غالب صفحہ ۳۲

مولوی نعمت علی عظیم آبادی اور دوسرے فارسی کے مستند استاد تھے[۵۱]۔ ادھر غالب بھی اکیلے نہیں تھے نواب اکبر علی خاں اور مولوی محمد محسن نے غالب کی طرف سے جواب دئے۔ غالب نے اس قصہ کو اس طرح بیان کیا ہے :-

"ازلوا درحالات ایں کہ سخن وران و نکتہ رسانِ ایں بقعہ پس از ورودِ خاکسار بزم سخنے آراستہ بودند۔ در ہر ماہ شمسی انگریزی روز یکشنبہ نخستیں سخن گویاں در مدرسہ سرکاری کمپنی فراہم شدندے و غزل ہائے ہندی و فارسی خواندندے۔ ناگاہ گرانمایہ مردے کہ از ہرات بہ سفارت رسیدہ است دراں انجمن می رسد و اشعار مرا شنودہ بہ بانگ بلند می ستاید۔ و بر کلام نادرہ گویانِ ایں قلمرو تبسم ہائے زیرلبی می فرماید چوں طبائع بالذات مفتونِ خود نمائی است ہمگنان حسد می برند۔ وکلانانِ انجمن و فرزانگانِ فن بر دو بیت من اعتراضِ نادرست برآوردہ آں را شہرت می دہند[۵۲]"

مختصر یہ کہ یہ پہلا موقعہ تھا کہ مرزا غالب نے مرزا قتیل کی سند (جو حقیقتاً غلط بیانی تھی۔ تفصیل آگے ملاحظہ فرمائیے) پہ معترض کی نشترزنی کا مزا چکھا۔ معترضین پہ تو خیر بگڑے ہی لیکن ساتھ ہی مرزا قتیل سے بھی باپ مارے کا بیر ہوگیا۔ اگر مرزا متانت سے اس اعتراض پہ غور فرماتے تو بآسانی یہ ثابت کر دیتے کہ یہ سند اتہام سے زیادہ نہ تھی۔ قتیل بیچارے نے نہ

---

۵۱ غالب نامہ صفحہ ۴۱

۵۲ خط بنام مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ

کہیں ایسا کہا نہ اپنی متعدد کتابوں میں کہیں ایسا لکھا۔ بلکہ یہ سب معترضین کے افترا پرداز طبائع اور زرخیز دماغ کی کارفرمائیاں تھیں۔ قتیل کے سر اس لئے منڈھ دیا گیا تھا کہ سند میں وزن اور ثقاہت پیدا ہو جائے۔ لیکن مرزا غالب کو یہ کہاں تاب تھی۔ ان کے یہ دماغ تھے کہ فیضی کی بھی کچھ اصلیت نہ سمجھتے تھے۔ مرزا قتیل کی (مفروضہ) سند پر ناک بھوں چڑھائی اور طعن و تشنیع پر اتر آئے۔ بولے دوالی سنگھ فریدآباد کے کھتری کے قول کو میں نہیں مانتا۔ اس پر بجا طور پر حاضرین میں جوش و خروش پیدا ہوا اور مرزا پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ جس پر تنگ آ کر انھوں نے مشہور مثنوی موسوم بہ "باد مخالف" لکھی۔ بے محل نہ ہوگا اگر یہاں اس کے کچھ حصے نقل کئے جائیں:-

اے تماشائیانِ بزمِ سخن ؛ وے مسیحا دمانِ نادرہ فن
اے سخن پرورانِ کلکتہ ؛ وے زبان آورانِ کلکتہ
اے بشغلِ وکالت آمادہ ؛ دادِ غم خواریٔ جہاں دادہ
اے عزیزانِ ایں سوادِ عظیم ؛ وے فراہم شدہ ز ہفت اقلیم
ہمچو من آرمیدۂ ایں شہر ؛ ہر کارے رسیدۂ ایں شہر
اسد اللہ بخت برگشتہ ؛ در خم و پیچ نجخہ سرگشتہ
گرچہ ناخواندہ مہمان شماست ؛ بے سخن ریزہ چیں خوان شماست
بہ تظلم رسیدہ است ایں جا ؛ بامید آرمیدہ است ایں جا
کار احباب ساختن رسم است ؛ مہمان را نواختن رسم است
آں رہ و رسم کارسازی کو ؛ شیوۂ مہماں نوازی کو
چہ بلا ہا کشیدہ ام آخر ؛ کہ بہ پنجاب رسیدہ ام آخر

نہ ہمیں نالہ و فغاں بلبم ؎ من و جان آفریں کہ جاں بلبم
مو بہ چوں موئے کردہ است مرا ؎ غصہ بدخوئے کردہ است مرا

پھر کہتے ہیں کہ مخالفت کا آغاز میری طرف سے نہیں ہوا اور جب اعتراض اٹھا کا جواب مل گیا تو پھر کیا وجہ کہ آپ لوگ میری تائید نہیں کرتے۔ آپ کی اس بات پر میری گفتگو کا انداز تلخ ہو گیا۔ لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ قدردان اصحاب اس پہ ناراض ہو گئے ہیں تو مجھے بڑی پشیمانی لاحق ہوئی۔ کاش میں چپ رہتا۔ پھر کہتے ہیں ؎

بندہ ام بندہ بہرہ باناں را ؎ رمز فہما و نکتہ داناں را
نہ ز آویزشش بیاں ترسم ؎ من و ایمان من کزاں ترسم
کہ پس از من بہ سالہائے دراز ؎ بر زباں ماند ایں حکایت باز
کہ سفیہے رسیدہ بود ایں جا ؎ چند روز آرمیدہ بود ایں جا
با بزرگاں ستیزہ پیش گرفت ؎ زحمتے داد و راہ خویش گرفت
شوخ چشمے و زشت خوئے بود ؎ بے حیائے و ہرزہ گوئے بود
برگ دنیا نہ ساز دینش بود ؎ ننگ دہلی و سرزمینش بود
آہ ازاں دم کہ بعد رفتن من ؎ خون دہلی بود بہ گردن من

پھر کہتے ہیں کہ نہ میں نے قتیل کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ نہ اس کی شہرت پہ رشک ہے۔ نہ میں اسے برا کہتا ہوں۔ دوستوں کو مجھ سے شکوہ ہے کہ میں قتیل کی پیروی کیوں نہیں کرتا ؎

دامن از کف کنم چگونہ رہا ؎ طالب و عرفی و نظیری را
خاصہ روح روان معنی را ؎ آں ظہوری جہان معنی را

آں کسے کردہ ایں مواقف را ؎ چہ شناسد قتیل و واقف را

آخر میں قتیل کی مدح لکھی ہے جو حقیقتاً ہجو ملیح ہے ؎

می شوم خویش را بہ صلح دلیل ؎ می سرایم نوائے مدح قتیل
تا نہ ماند ز من دگر گلہ ؎ رسد از بیروان وے صلہ
گرچہ ایرانیش نہ خواہم گفت ؎ سعدی ثانیش نہ خواہم گفت
لیک از من ہزار بار بہ است ؎ از من و ہمچو من ہزار بہ است
من کف خاک و او سپہر بلند ؎ خاک را کے رسد بچرخ بلند
وصف او حد چوں منے نہ بود ؎ بہر ورخورد درو زنے نہ بود
مرحبا ساز خوش بیانئے او ؎ حبذا شور نکتہ دانئے او
نظمش آب حیات را ماند ؎ در روانی فرات را ماند
نثر او نقش بال طاؤس است ؎ انتخاب صراح و قاموس است
بادشاہے کہ در قلمرو حرف ؎ کردہ ایجاد نکتہ ہائے شگرف
خامہ ہندوئے پارسی دانش ؎ ہندیاں سر بخط فرمانش
ایں رقم ہا کہ ریخت کلک خیال ؎ بود سطرے ز نامۂ اعمال
از من نارسائے ہیچمدان ؎ معذرت نامہ ایست نزد یاراں
بو کہ آید ز عذر خواہی ما ؎ رحم بر ما و بیگناہی ما
آشتی نامہ وداد پیام ؎ ختم شد والسلام والاکرام

لیکن جیسا کہ ظاہر ہے اس معذرت میں بھی تعریضات کے اس قدر تیز نشتر تھے کہ اس سے سکون ہونا تو درکنار مخالفت اور بڑھ گئی۔ غالب یہ چرکا بھولنے والے نہ تھے۔ جا اور بے جا۔ موقعہ سے اور بے موقعہ

جہاں اور جب ان کا ڈھب پڑا انھوں نے مرزا قتیل کو گالیاں دینے میں کسر نہ اٹھا رکھی ۔ اس جگہ یہ انتہائی افسوس کے ساتھ ماننا پڑیگا کہ غالب نے اس دریدہ دہنی اور رکیک پنے سے مرزا قتیل پر حملے کیئے کہ خود مرزا غالب کی طرف سے طبیعت کو تنفر ہونے لگتا ہے ۔ مرزا قتیل کے انتقال کو ایک مدت ہو گئی تھی اور معمولی تہذیب اور تمیز کا تقاضا تھا کہ ان پر ایسے حملے نہ کیئے جائیں جن کا تعلق ذات سے ہو ۔ علم و ادب سے دور کا واسطہ بھی نہ ہو ۔ لیکن چلتے ہوؤں کے پتھر مارنے کی مثل مرزا غالب پر پوری اتری ۔ یہ صحیح ہے کہ مرزا قتیل نو مسلم تھے ۔ لیکن مسلمان ہونے کے بعد وہ نہایت نیک مسلمان ثابت ہوئے ۔ ان کا اخلاق ان کی علمیت ان کی خدا دوستی اور ان کی خدا ترسی زبان زد خلائق تھی ان کی ذات دنیاوی ، دینی اور علمی غرضکہ ہر نقطہ نظر سے دراصل منبع فیض تھی ۔ اس کے خلاف خود غالب کس قدر شرع کے پابند تھے ؟ اس کے بتانے کی نہ یہاں ضرورت نہ جگہ ۔ لیکن اس کے باوجود مرزا قتیل کو انھوں نے ہمیشہ دیوالی سنگھ ، ہندو بچہ کھتری بچہ لقب سے یاد کیا ۔ چودھری عبدالغفور سرور نے اپنے ایک رقعہ میں مرزا قتیل کو " مرحوم " لکھا غالب اس سے چراغ پا ہو گئے ۔ جواب میں اس پر طنز کی اور خود اصلاح دے کر " لالہ دیوالی سنگھ قتیل ، متوفی " لکھا ۔[۹۱] ایک اور جگہ لکھتے ہیں " اصل فارسی کو اس کھتری بچے قتیل علیہ ما علیہ نے تباہ کیا "[۹۲]

---

[۹۱] ادبی خطوط غالب صفحہ ۶۴

[۹۲] " " " " ۶۸

ایک اور جگہ قتیل کی عداوت میں کہتے ہیں " مشرک وہ ہیں جو نو مسلموں کو ابو الائمہ کا ہمسر مانتے ہیں[۵۱] " ایک جگہ لکھا ہے " چار شربت[۵۲] اور غیاث اللغات کو حیض کا لتہ[۵۳] سمجھتا ہوں۔ ایسے گمنام چھوکروں سے کیا مقابلہ کروں گا[۵۴] " ایک اور جگہ گل افشانی فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں۔" وہ گھاگھس ابو عبد الواسع ہانسوی .... اور وہ اُلّو کا پٹھا قتیل " اصل یہ ہے کہ یہ جلے پھپھولے اس لئے اور بھی پھوڑے جاتے تھے کہ یوں حقیقت میں تو قتیل کی کوئی قابل گرفت غلطی پا نہ سکے گالیاں دے دے کر اور منہ چڑا چڑا کر اپنا دل ٹھنڈا کرنا پڑا۔ کلکتہ کے واقعہ کے بعد سے قتیل کی دشمنی انکی رگ رگ میں پیوست ہو گئی تھی۔ ادھر قتیل کی مقبولیت اوران کو خشمگیں کئے دیتی تھی۔ چودھری عبد الغفور کو لکھتے ہیں

---

۵۱ یادگار غالب صفحہ ۱۳۶

۵۲ چار شربت قتیل کی مشہور کتاب ہے۔

۵۳ غالب کو اس موضوع سے خاص دلچسپی تھی۔ ایک جگہ نواب علاؤ الدین کے نام کے خط میں مولوی حمزہ خاں کو لکھتے ہیں۔" رسائل ابو حنیفہ کو دیکھنا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطے اور ہے اور عرفا کے کلام سے حقیقت حقہ وحدت وجود کو اپنے دل نشین کرنا اور " ۔ ایک جگہ اور نواب شہاب الدین کے نام کے خط میں کسی قاضی کے متعلق ارشاد ہوتا ہے" میاں وہ قاضی تو چوتیا مسخرہ ہے " (غالب کی شوخیاں صفحہ ۶۴) یوسف مرزا کے نام خط میں لکھتے ہیں " ترحم یہ ہے تو تغافل کیا ہوگا۔ میں خود موجود ہوں اور حکام صدر کا روشناس پشم نہیں اکھیڑ سکتا " (غالب کی شوخیاں صفحہ ۶۴)

۵۴ اردی خطوط غالب صفحہ ۱۶۴

"قتیل لکھنوی اور غیاث الدین ملائے مکتبی رامپوری کی قسمت کہاں سے لاؤں کہ تم جیسا شخص میرا معتقد ہو اور میرے قول کو معتمد سمجھے"

مرزا غالب کے حالات ایسے ہوتے رہے کہ غدر سے پہلے انکو اتنا اطمینان نہ مل سکا کہ وہ قتیل وغیرہ سے پورا پورا انتقام لے سکیں

مرزا غالب کا قیام کلکتہ قطعی بے سود ثابت ہوا۔ دو سال گذر گئے اور جس منزل کو پیش نظر رکھ کر نکلے تھے وہاں تک رسائی نہیں ہوئی تو مرزا کی طبیعت پر مایوسی غالب آگئی. اور نہایت یاس کے عالم میں واپس دلی پہنچے۔ ناکامیاں کسی طرح پیچھا نہ چھوڑتی تھیں اور ان کی وجہ سے ان کی مزاج کی تلخی بڑھتی جاتی تھی قتیل کی مخالفت بھی شدت پکڑتی جاتی تھی لیکن حالات کی ناساعدت سب پر حاوی تھی اور اسی وجہ سے مرزا ابھی تک قتیل وغیرہ کے خلاف جی بھر کے غبار نہ نکال سکے تھے، گویہ کھٹک جان کے ساتھ لگی رہی۔ حسب ذیل تفصیلات سے یہ واضح ہوگا کہ کلکتے سے واپسی کے بعد سے غدر تک وہ قتیل کی طرف کیوں متوجہ نہ ہو سکے:۔

"۱۱ نومبر ۱۸۲۹ء کو وہ دلی واپس پہنچے تھے۔ اس وقت سے اور ۲۷ جنوری ۱۸۳۱ء تک پنشن کے سلسلے میں وہ انتہائی مشغول رہے۔ ۲۷ جنوری ۱۸۳۱ء کو پنشن کا فیصلہ غالب کے خلاف سنا دیا گیا۔ اور گویا ان کی ساری امیدوں پر اوس پڑ گئی۔" مرزا کو ایک تو اتنی کوشش رائیگاں جانے کا افسوس تھا دوسرے اہالیان دہلی کے طعنے جن سے بچنے کے لئے معلوم ہوتا ہے انھیں شروع شروع میں کنج عزلت میں پناہ لینی پڑی۔ ابتدا میں تو مایوسی اور رنج کی شدت سے طبیعت فکر شعر کے ناقابل تھی لیکن آہستہ آہستہ اس

زخم کا اندمال ہونا شروع ہوا[۵۱]" اس کے بعد مسٹر ولیم فریزر دلّی کے ریذیڈنٹ ہو کر آئے اور ان سے غالب کے تعلقات بہت استوار ہو گئے۔ غالب نے اس دوستی سے فائدہ اٹھانا چاہا اور پھر اپنی پنشن کا معاملہ اٹھایا۔ مسٹر ولیم فریزر نے کچھ امیدیں بھی دلائیں۔ وہ نواب شمس الدین خاں کے خلاف پہلے ہی سے تھے۔ غالب کو اس تعلق سے بڑی توقعات تھیں لیکن ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو ولیم فریزر قتل کر دئیے گئے اس واقعے سے صرف یہی نہیں کہ غالب کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ بلکہ جب نواب شمس الدین بھی اس جرم میں ماخوذ ہوئے تو لوگوں نے کھلم کھلا کہنا شروع کیا کہ یہ چغلی غالب نے کھائی ہے نواب موصوف کو ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو پھانسی دی گئی لیکن اس کے بہت عرصے بعد تک غالب کے خلاف اس اخلاقی کمزوری پر لے دے ہوتی رہی۔ اسی زمانہ میں دو ساہوکاروں کی ڈگریاں بھی ان کے خلاف تھیں اور وہ قید کے ڈر کے مارے خانہ نشین ہو گئے تھے صرف رات کو باہر نکلا کرتے تھے۔ اس کے بعد فارسی دیوان کی ترتیب میں مشغول رہے اور میخانۂ آرزو ۱۸۳۷ء میں ختم ہوا۔ پھر اردو دیوان کی باری آئی اور وہ پہلی بار ۱۸۴۲-۱۸۴۱ء میں طبع ہوا۔ ۱۸۴۷ء میں جوے کے الزام میں تین ماہ کی قید بھگتنی پڑی۔ ۴ جون ۱۸۵۰ء کو شاہ نصیر الدین عرف کالے صاحب کے توسل سے دربار دلّی تک باقاعدہ تعلق ہو جانے میں کامیابی ہوئی اور مہر نیم روز لکھنے پر مقرر ہوئے۔ اور ولی عہد کی استادی بھی حاصل ہوئی۔ ۱۸۵۴ء میں ذوق چل بسے اور غالب کو

۵۱؎ غالب نامہ صفحہ ۴۷

بادشاہ سلامت کی استادی بھی میسر آئی ۔ اسی سال رام پور سے بھی تعلق استوار ہوا ۔ یہ مصروفیت غدر تک رہی ۔ پھر اس تمام تیس برس کے عرصے میں پنشن کا مسئلہ اور سب مصروفیتوں اور تفکرات پر مستزاد تھا جس کے لئے وہ ہر لمحہ و ہر لحظہ کوشش کرتے رہتے تھے" بہر حال غالب ۱۸۲۶ء سے لے کر ۱۸۴۴ء تک اس قضیہ میں الجھے رہے ۔ اور اس ضمن میں نئی پنشن نئے خطاب اور نئے اعزاز کی توقع پیدا ہوئی جو ۱۸۵۷ء تک خدا جانے کشاکش و فراغت بال کے کیسے کیسے خیالی منظر ان کے سامنے پیش کرتی رہی[۹۵]" یہی وہ وجوہات کہ مرزا غالب اپنے دل کے پالے پھپھولے نہ پھوڑ سکے ۔ اب جو غدر ہوا تو ساری دنیا پلٹ گئی ۔ نہ دربار رہا نہ درباداری نہ تعلقات نہ آنا جانا ۔ شہر کمپ ہو گیا ۔ غالب اپنا دروازہ بند کر کے بیٹھ رہے ۔ نہ یار نہ دوست صبح سے شام اور شام سے صبح تنہائی میں کٹنے لگی ۔ اب فرصت ہی فرصت تھی ۔ ادھر ہندوستانی بادشاہت کی بساط الٹ چکی تھی ۔ انگریزی حکومت میں اب کوئی شبہ نہیں رہا تھا ۔ سوچا اس انقلاب کے متعلق کچھ ایسا لکھوں کہ آئندہ چل کر اس کی وجہ سے اپنی بریت ثابت ہو بلکہ صاحبان انگریز سے رشتہ بھی استوار ہو تاکہ مددگاری اور وفاداری کے انعامات سے بہرہ ور ہو سکوں ۔ فارسی دانی اور ایرانی الاصل ہونے کا دعویٰ برسوں سے کر ہی رہے تھے عربی یوں بھی کم جانتے تھے ۔ ارادہ کیا کہ اس طرح کی کتاب ہو کہ سوائے

---

۹۵ غالب از مہر صفحہ ۱۲۳

فارسی اور کسی زبان کا لغت نہ آئے - یہ ارادہ کرنے کو تو کر لیا - لیکن اس کے لئے ان کا وجدانی ذوق کافی نہ ہوا - اور ہندی فارسی دانوں کی لغت کے بغیر کام نہ چلا - اس وقت ان کے پاس رسا نیراور برہان قاطع[۵] ان دو کتابوں کے علاوہ اور کوئی کتاب نہ تھی - انہی دو کتابوں کی مدد سے دستنبو لکھی گئی - یوں بھی فارسی کی لغت کسی ایرانی نے لکھی ہی نہ تھی اور ہندیوں کی لکھی ہوئی لغت کے علاوہ کچھ اور ملنے کا امکان نہ تھا - ان کے جذبۂ ایران پرستی کو اس سے بھی ٹھیس لگی ہو گی کہ یہ لغت نویسی کا کام بھی انہی فرومایہ ہندیوں کا مرہون منت تھا - شکر ایک طرف اور الٹے اس کے خلاف ہو گئے - ادھر مرزا قتیل کی مخالفت تو ہر وقت تازہ ہی تھی - قتیل نے بھی اپنی کتابوں خصوصاً نغمات میں صراح قاموس وغیرہ کے ساتھ برہان قاطع کا بھی کئی جگہ ذکر کیا ہے - غرضیکہ ان سب وجوہات کی بنا پر غالب نے برہان قاطع کو بہت ہی معاندانہ نظر سے دیکھا - نقص نکالنا کچھ بہت مشکل نہیں - پھر برہان میں تو ترتیب وغیرہ کی وجہ سے نقص نکالنے کی گنجائش بھی خاصی تھی بس غالب نے قتیل اور دیگر ہندی فارسی دانوں کا سارا غصہ صاحب برہان پر اتارا - کچھ اس کی یہ بھی وجہ تھی کہ باوجود کوشش کے وہ قتیل کی تحریرات میں کوئی واقعی گرفت نہ کر سکے - بہرحال مرزا غالب نے برہان پر

---

۵ یہ مولوی محمد حسین تبریزی دکنی کی لکھی ہوئی لغت فارسی کی مشہور کتاب ہے - برہان قاطع کا وہ نسخہ جو ایام غدر میں مرزا کے مطالعہ میں تھا اور جس کے حاشیہ پر انھوں نے اپنے اعتراضات لکھے تھے اب ریاست لوہارو کے کتب خانے میں محفوظ ہے -

جا و بیجا اعتراضات کا طومار باندھ دیا۔

برہان قاطع کا ہنگامہ قتیل دشمنی کا شاخسانہ تھا

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ برہان قاطع کا ہنگامہ اصل میں قتیل دشمنی کا شاخسانہ تھا۔ مہر صاحب فرماتے ہیں :-

" وہ (غالب) شروع ہی سے قتیل، واقف اور ایسی قماش کے دوسرے شعراء کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ لیکن کلکتہ میں اس رائے کے اظہار پر جو معرکہ تعریفیات گرم ہوا اس نے غالب کے جذبۂ مخالفت میں بہت تندی تیزی اور تلخی پیدا کر دی۔ یہی جذبۂ مخالفت انجام کار قاطع برہان کی شکل میں ظاہر ہوا[۵۱]" خود غالب نے بھی مفتی میر عباس کو خط میں لکھا ہے کہ " قاطع برہان کا لکھنا گویا باسی کڑھی میں ابال آیا[۵۲]" غدر کے فوراً ہی بعد تو غالب اپنی بریت اور انگریزوں کی خوشامد میں مشغول رہے ۱۸۵۸ء میں معاش کی طرف سے انتہائی پریشانی رہی کیوں کہ وہ ساڑھے باسٹھ روپیہ والی پنشن بھی بند تھی۔ کہیں اوائل ۱۸۵۹ء میں برہان قاطع کے اعتراضات کو مرتب کر سکے جو ۱۸۶۲ء " قاطع برہان " کے نام سے شائع کیے گئے۔ اس میں بھی مرزا نے حسب دستور اس قدر قابل اعتراض طریقہ تحریر روا رکھا کہ ملک میں بجا طور پر ان کے خلاف سخت جذبہ پیدا ہو گیا۔ خواجہ حالی مرحوم نے اس کی توجیہ فرمائی ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ محض عذر

---

۵۱ غالب از مہر صفحہ ۹،

۵۲ ادبی خطوط غالب صفحہ ۱۴۳

تنگ ہے۔ شیخ محمد اکرام صاحب کا فیصلہ اس ہنگامے کے متعلق سنئے :۔ "بدقسمتی سے بحث نے بہت تلخ پہلو اختیار کر لیا تھا۔ اور اس کی وجہ مرزا کی طرزِ تحریر تھی....... اگر مرزا اس علمی بحث میں ذاتیات کو نہ لے آتے تو مخالفین بھی اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیتے۔ علاوہ ازیں اگر بفرضِ محال یہ مان بھی لیا جائے کہ پرانے تعلیم یافتہ اپنی شہرت کے لئے مشہور آدمیوں کی مخالفت کرتے ہیں، تب بھی نا ملائم الفاظ کے استعمال میں جو عیب ہے وہ کم نہیں ہو جاتا۔ حقیقت یہ ہے اور مرزا کے سوانح نگار کو اس امر کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ مباحثہ کے وقت وہ اپنے ترکش کے سارے تیر استعمال کرتے تھے........ مصنف سے اختلاف کیا تو دلائل و براہین پر اکتفا نہ کی بلکہ اپنے قلم سے تیر و نشتر کا کام بھی لیا۔[۵۱]"

اس معرکہ میں حسبِ ذیل کتابیں موافق و مخالف محاذ سے شائع ہوئیں :۔

(۱) برہانِ قاطع پر مرزا غالب نے جو اعتراضات کئے تھے وہ انھوں نے قاطع برہان (فارسی) کے نام سے طبع کرائے۔ پھر اسی قاطع برہان کا دوسرا اڈیشن درفشِ کاویانی کے نام سے چھپوایا۔

(۲) مرزا غالب کی ان کتابوں کے جواب میں حسب ذیل کتابیں شائع ہوئیں :۔

ل ۔ محرقِ قاطع برہان (فارسی) از مولوی سید سعادت علی

---

۵۱ غالب نامہ صفحہ ۹۴، ۹۵

ب ساطع برہان (فارسی) از مرزا رحیم بیگ صاحب میرٹھی

ج قاطع القاطع (فارسی) از امین الدین امین پٹیالہ

د موید البرہان (فارسی) از مولوی آغا احمد علی اصفہانی

(۳) ان مخالف کتابوں کے یہ جوابات دیئے گئے:-

ا محرق قاطع برہان کے جواب میں

(ا) دافع ہذیان (فارسی) از مولوی نجف علی

(اا) لطائف غیبی (اُردو) مصنفہ غالب بنام میاں داد خاں سیاح

(ااا) سوالات عبدالکریم (اُردو) " " " عبدالکریم

ب ساطع برہان کا جواب

(ا) نامہ غالب (اُردو) از مرزا غالب

د موید البرہان کے جواب:-

(ا) قطعہ فارسی از غالب

(اا) تیغ تیز (اُردو) "

(۴) مرزا غالب کے فارسی قطعہ کا جواب مولوی عبدالصمد فدا[۵۱] نے فارسی قطعہ ہی میں دیا۔

---

۵۱ ان ساری تصانیف کا بیان جناب مالک رام صاحب کی کتاب ذکر غالب سے لیا گیا ہے۔ ہم نے خود نہ ہنگامہ دل آشوب دیکھا نہ مولوی عبدالصمد فدا کا قطعہ۔ مالک رام نے جو فدا کا نام اور وطن (سلہٹ) لکھا ہے وہ سمجھ میں نہیں آتا۔ مولوی عبدالغفور نساخ بنگالی کا تذکرہ سخن شعرا عام طور پر بہت مفصل ہونے کے علاوہ بنگالے کے سارے (باقی صفحہ ۵۶ پر)

(۵) مولوی عبدالصمد فدا کے قطعہ کا جواب :۔

ا قطعہ فارسی از سید محمد باقر علی باقر

ب " " " سید فخرالدین حسین سخن

نوٹ :۔ یہ چاروں فارسی کے قطعے (مرزا غالب، فدا، باقر اور سخن کے) "ہنگامہ دل آشوب" کے نام سے اکٹھے چھاپے گئے

چھوٹے بڑے شاعروں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ اس میں میر عبدالصمد فدا کو بنگال کا باشندہ نہیں لکھا۔ بلکہ ان کے متعلق حسب ذیل عبارت ہے :۔

" فدا تخلص۔ میر عبدالصمد دہلوی۔ فرید آباد میں معلمی کرتے تھے۔ صاحب دیوان گذرے فارسی بھی کہتے تھے۔ نمونہ کلام :۔

جو درد دل کا لکھوں یار کو میں لے کاغذ ۔ تو اشک یاں تلک امڈے کہ بہہ چلے کاغذ"

نساخ مرحوم ایک اور فدا کا ذکر کرتے ہیں۔ جو بنگال میں جا رہے تھے۔ وہ سنئے :۔

" فدا تخلص۔ امام الدین فرید آبادی۔ شاگرد مرتضٰی قلی خاں فراق۔ علی وردی خاں کے عہد میں بنگالے میں آکر سکونت اختیار کی۔ نمونہ کلام :۔

اب جائیں کہاں تری گلی سے ۔ جوں نقش قدم ہیں رہے ہم

تو بات بات میں ہوتا ہے مجھ سے آزردہ ۔ یہی تو کچھ نہیں اے دل ربا تری باتیں

میں ہوں قربان اسکے کہنے کے ۔ تو نہ بولا کر اے فدا ہم سے "

میں نہیں کہہ سکتا کہ مرزا غالب کے جواب میں جو فارسی قطعہ لکھا وہ مولوی عبدالصمد فدا دہلوی کا ہے یا امام الدین فدا فرید آبادی ساکن بنگال کا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی تیسرے صاحب مولوی عبدالصمد فدا سلہٹی بھی ہوں جنکا یہ قطعہ ہے۔ اور جو شاید فارسی کے علاوہ اردو مطلق نہ کہتے ہوں اسی لئے نساخ نے ان کا ذکر نہیں کیا۔

(۶) باقر و سخن کے قطعات کے جواب میں :-

ا قطعہ فارسی از مولوی عبدالصمد فدا (دوم)

نوٹ :- یہ قطعہ مع گذشتہ چار قطعوں کے یکجا بنام "تیغ تیز تر" شائع کئے گئے۔

ب قطعہ فارسی از منشی جواہر سنگھ جوہر لکھنوی شاگرد ناطق مکرانی۔

(۷) قطعہ فارسی فدا (دوم) اور قطعہ فارسی جوہر کے جواب میں :-

ا قطعہ فارسی باقر (دوم)

ب " " سخن (دوم)

(۸) ایرادات بر اشعار مرزا غالب (اردو و نثر) از میر آغا علی شمس[1] لکھنوی

(۹) ایرادات شمس کے جواب میں :-

ا در نثر فارسی از باقر

ب در نثر اردو از سخن

ج قطعہ اردو از محمد امیر امیر لکھنوی

نوٹ :- قطعہ فارسی فدا (دوم) قطعہ فارسی جوہر، قطعہ فارسی باقر (دوم)

---

[1] میر آغا علی شمس لکھنوی۔ قاضی محمد صادق خاں اختر (شاگرد تسلیں) کے شاگرد تھے، نمونہ کلام :-

یہ تو فرمائیے کب آئیے گا ٭ لو خوشی آپ کی رخصت ہی سہی
نہ کرو بات ادھر دیکھ تو لو ٭ نہیں الفت تو مروت ہی سہی
کٹی شب یار کی آرائشوں میں ٭ سحر تک زلف گھبرا کی بنا کی
تماشا حسن انھوں لاتھ لوٹے ٭ بندھی مٹھی کھلی قسمت حنا کی

قطعہ فارسی سخن (دوم) ایرادات شمس نثر اردو، مضامین باقر فارسی، مضامین سخن اردو و قطعہ اردو آمیز یہ سب یکجائی بنام "ہنگامہ دل آشوب حصہ دوم" طبع ہوئے۔

(۱۰) تیغ تیز (غالب) کے جواب میں منشی احمد علی اصفہانی نے "شمشیر تیز تر" لکھی شمشیر تیز تر اس معرکے کی آخری کتاب تھی جو ۱۸۶۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد کسی جانب سے کوئی کتاب نہیں چھپی۔

اس ہنگامہ کو صحیح طور پر پرکھنا اور جانچنا کہ غالب کے اعتراضات کہاں تک درست تھے یا جو جوابات دیئے گئے وہ کس درجے کے تھے ایک الگ فرصت چاہتا ہے۔ یہ تفصیلات یہاں یقیناً بے محل بھی ہونگی لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ غالب کی "قاطع برہان" نے ملک بھر میں آگ سی لگا دی۔ ظاہراً یہ قتیل سے بے تعلق سی چیز تھی۔ لیکن اس کے جواب میں جو رسالے مختلف اصحاب کے نام سے مختلف صوبہ جات سے نکلے ان سب میں مرزا قتیل کو بہت سراہا تھا خصوصاً صاحب موید البرہان نے قتیل کی بہت تعریف کی تھی۔ ادھر سے مخالفین کا جواب خود مرزا ہی لکھتے تھے گو مصلحتاً اپنے شاگردوں کے نام سے شائع کراتے رہتے تھے۔ لطائف غیبی سیاح کے نام سے، محرق کا جواب قدر بلگرامی کے نام سے، موید کا جواب ذکا کی طرف سے لکھا یا لکھنا چاہا۔ مرزا تفتہ کو اسی سلسلے میں لکھتے ہیں" وہ شخص ایسا کہاں کا فارسی داں ہے کہ میں لڑکوں کی طرح بیت تختی کروں۔ دو جوتیاں آپ لگادیں ایک جوتی تم سے لگوادی"۔ لیکن سنجیدہ اور ثقہ لوگ مثلاً خواجہ غلام غوث بے خبر جو گو غالب کے کمال شاعری کے معترف تھے پر اس قاطع برہان والی بحث میں

مرزا سے متفق نہیں تھے[91] گو لحاظ اور دوستی کی بنا پر ان کے خلاف بھی کچھ نہ لکھتے تھے۔ خواجہ غلام غوث بے خبر سے غالب کی دوستی کا معاملہ بھی خاصہ دلچسپ ہے۔ مرزا غالب کی قتیل دشمنی کی انتہا یہ تھی کہ جس کا تھوڑا بہت بھی مرزا قتیل سے تعلق سن پاتے تھے اس کے بھی دشمن ہو جاتے تھے چنانچہ مولوی غلام امام شہید[92] (شاگرد قتیل) وغیرہ سے بھی بیر تھا۔ خواجہ غلام غوث بیخبر غالباً مولوی شہید کے شاگرد تھے یا کم از کم ان کے بے حد مداح ضرور تھے۔ عام حالات میں غالب کی مخالفت کے لئے اتنا تعلق کافی تھا۔ لیکن یہاں الٹی مرزا دوستی کرنے کی فکر میں تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خواجہ صاحب لفٹنٹ گورنر کے میر منشی تھے۔ اور غالب کو ان سے حصول مقاصد کی امید تھی۔ اور صاحبان انگریز کی آمد و رفت، تبدیلی اور تعیناتی۔ مزاج عادت وغیرہ

---

۹۱ غالب نامہ صفحہ ۹۵

۹۲ حالانکہ غالب نے مولوی شہید صاحب کو دیکھا تک نہیں تھا لیکن قتیل کے تعلق کی وجہ سے وہ ان کے بھی دشمن ہو گئے تھے۔ منشی حبیب اللہ ذکا حیدر آبادی کو لکھتے ہیں "صنعت سہل ممتنع میں میں نے نواب مختار الملک (سر سالار جنگ) کو قصیدہ بھیجا۔ کچھ قدر دانی نہ فرمائی۔ رد فرقہ وہابیہ میں ایک مثنوی محی الدولہ کو بھیجی۔ رسید نہ آئی۔ اب سنتا ہوں کہ مولوی غلام امام شہید شاگرد قتیل وہاں کوس انا ولا غیری بجا رہے ہیں اور سخن ناشناسوں کو اپنا زور طبع دکھا رہے ہیں" لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ یہی لوگ جن کو مرزا داد خواہی کے طور پر مولوی شہید کے خلاف لکھتے تھے اصل میں مولوی شہید صاحب کے بے حد معترف تھے اور غالب کی نفرین کے باوجود انکی بہت (بقیہ ص ۶۰ پر)

ان کے ذریعہ معلوم ہوتا رہتا تھا[۹۰] چنانچہ مرزا ان سے خوب نبھائے ہوئے تھے بلکہ خاصے خوشامدانہ خط لکھتے رہتے تھے۔

موید البرہان کے جواب میں مرزا نے تیغ تیز لکھی اور ایک فارسی قطعہ بھی صاحب موید کو لکھ بھیجا جس میں یہ نئی منطق چھانٹی کہ میں گالیاں دوں تو مجھے روا ہے۔ لیکن تم کو ایسا نہیں چاہیئے۔ اس قطعہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

---

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) قدر کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک بار یہی منشی حبیب اللہ ذکا مرزا غالب سے مولوی شہید ہی کے سلسلے میں خفا بھی ہو گئے۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک بار ذکا نے شہید کی غزل پر غزل لکھ کر غالب کو بھیجی مرزا غالب نے غزل پر اصلاح تو دیدی لیکن خبر نہیں خط میں مولوی شہید کو کیا کچھ لکھ دیا کہ منشی حبیب اللہ صاحب ذکا کو بہت ناگوار گذرا۔ بلکہ کسی سے مرزا کی شکایت کی اور اپنی اہانت کا گلہ کیا۔ خواجہ غلام غوث بیخبر کو یہ معلوم ہوا تو وہ بیچ میں پڑے اور فریقین کو کچھ لکھ لکھا کر صلح صفائی کرادی۔

اصل میں مرزا غالب کو ہر اس شخص سے اللہ واسطے کی دشمنی ہو جاتی تھی جس کا دور دراز کا بھی کچھ تعلق قتیل سے ہو جاتا تھا۔ مولوی غیاث الدین رام پوری مولف غیاث اللغات نے اپنی لغت دیباچہ میں جہاں اور کئی ایک ماخذ گنوائے ہیں وہاں مرزا قتیل کی کتاب چار شربت کا بھی حوالہ دیا ہے۔ بس اس خطا پر غالب نے بے چارے مولوی صاحب کو جا اور بے جا بہت کچھ کہہ دیا۔ فرماتے ہیں "غیاث الدین رام پور ایک ملانے مکتبی تھا۔ ناقل نہ عاقل۔ جس کا ماخذ اور مستند علیہ قتیل کا کلام ہو گا اس کا فنِ لغت میں کیا فرجام ہو گا"

(بنام قاضی عبدالجمیل) ۹۰؎ غالب از مہر صفحہ ۲۳۲

خوشامد طرفداری

با قتیلِ و جامع برہان و لالا ٹیک چند ⁂ لابہ و سوگیری و لطف و مدارا کردہ است

انتقام جامع برہانِ قاطع می کشد ⁂ انچہ ما کردیم با وے خواجہ با ما کردہ است

من سپاہی زادہ ام گفتارمن باید درشت ⁂ ولئے بر شے گہ تقلید من انیہا کردہ است

غرضکہ مرزا غالب اسی قسم کے بے بنیاد الزاموں اور بے دلیل دعووں سے مرزا قتیل کا خاکہ اڑانا چاہتے تھے۔ کہیں اپنے شاگرد کو لکھتے ہیں "کہ قتیل اساتذہ سلف کے کلام سے قطعاً آشنا ہی نہیں"۔ اپنے ایک ذی علم غائبانہ دوست مولوی صاحبِ عالم صاحب کو لکھا ہے "عقل کو کام میں لاؤ غور کرو سمجھو قتیل پڑھا نہ تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ میں پڑھا نہیں ہوں" پھر انہی صاحب سے ارشاد ہوتا ہے۔ کہ "قتیل تو اس قابل بھی نہیں کہ اس کا نام لیجیئے"۔ اس پر صاحب عالم صاحب بگڑتے ہیں اور غالب کو مدت تک خط نہیں لکھتے۔ قاضی عبدالجمیل بریلوی کی غلطی نکالتے ہیں اور تضحیک کے طور پر کہتے ہیں "یہ فارسی لالہ قتیل کی ہے" میر مجروح کو لکھتے ہیں "تم اردو میں مرزا قتیل بن گئے ہو۔ اردو بازار میں نہر کے کنارے رہتے رہتے ردِ قتیل بن گئے ہو" اپنے ایک لائق شاگرد قدر بلگرامی کو اصلاح دیتے وقت عاجز ہو کر کہتے ہیں "مگر یہاں شیوۂ قتیل بندہ مجبورم۔ یہاں سکہ قتیل"۔

مرزا غالب کے مرزا قتیل پر اعتراضات

گالیاں تو سن لیں۔ اب آئیے دیکھیں مرزا غالب نے قتیل کی واقعی کیا کیا غلطیاں پکڑی ہیں اور اس عیب جوئی میں وہ کہاں تک حق بجانب تھے۔ ہم ان کو سلسلہ وار عرض کرینگے:-

(۱) مرزا قتیل اساتذہ کے کلام سے ناآشنا ہیں۔ مرزا غالب فرماتے ہیں:-

"قتیل اساتذہ سلف کے کلام سے قطعاً آشنا ہی نہیں۔ اس کے علم فارسی کا ماخذ ان لوگوں کی تقریر ہے جو کہ نواب سعادت علی خاں کے وقت میں ممالک مغربی کی طرف سے لکھنؤ میں آئے اور ہنگامہ آرا ہوئے۔ بیشتر سادہ کشمیری یا کابلی و قندھاری و کرانی احیاناً کوئی عامۂ اہل ایران میں سے بھی کوئی ہو۔ تاہم کہ فضلائے ایران میں سے بھی کوئی ہوگا"
(بنام چودھری عبدالغفور سرور)

(۲) مرزا قتیل نے تحریر کو تقریر جیسا بنا دیا۔ مرزا غالب فرماتے ہیں:-

"تقریر اور ہے تحریر اور ہے۔ اگر تقریر بعینہ تحریر میں آیا کرے تو خواجہ وطواط اور شرف الدین علی یزدی اور ملا حسین واعظ کاشفی اور طاہر وحید یہ سب نثر میں کیوں خون جگر کھاتے وہ سب اسی طرح کی نثریں جو لالہ دیوالی سنگھ قتیل متوفی نے بہ تقلید اہل ایران لکھی ہیں رقم نہ فرماتے۔"
(بنام چودھری عبدالغفور سرور) پھر فرماتے ہیں:-

"مگر یہ پیروی قتیل کی ہے کہ وہ ایرانیوں کی تقریر کے موافق تحریر بناتا ہے" (بنام قدر بلگرامی)

(۳) مرزا قتیل کا دعویٰ ہے کہ "کدہ" کا لفظ سوائے پانچ اسمار کے اور کسی سے ترکیب نہیں پاتا۔ مرزا غالب نے چودھری عبدالغفور سرور کو لکھا ہے:-

"یہ شخص (قتیل) مدعی ہے کہ کدہ کا لفظ سوائے پانچ چار اسم کے اور اسم کے ساتھ ترکیب نہیں پاتا۔ پس آرزو کدہ، دلو کدہ اور نشتر کدہ اور امثال اس کے جو ہزار جگہ اہل زبان کے کلام میں آیا وہ نادرست ہے۔

ہیں اور آپ بیٹھیں اور اس کے خرافات پڑھے جائیں اور جو میں کہوں اس پہ حضرت غور فرمائیں تب معلوم ہو کہ یہ کتنا لغو اور فارسی دانی سے کتنا بیگانہ ہے" منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:-

"اور یہ اُلّو کا پٹھا قتیل صفوتکدہ و شفقت کدہ و نشتر کدہ کو اور ہمہ عالم و ہمہ جا کو غلط کہتا ہے"

(۴) اقسام نثر بتانے میں قتیل نے غلطی کی اور مرجز و مسجع کا فرق ٹھیک نہیں بتایا۔ غالب فرماتے ہیں:-

"الفاظ فقرتین وزن میں برابر ہوں وہ مسجع۔ اس صفت کو بیشتر نثر مقفیٰ میں صرف کرتے ہیں اور چاہو قافیے کا التزام نہ کرو۔ بہر رنگ اقسام ثلثہ نثر یہی ہیں۔ حضرت نے نثر مسجع کو نثر مرجز لکھا ہے۔ جواب وہی ہے کہ اگر مرجز یہ ہے تو مسجع کس نثر کو کہتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہ مجھ کو علم نہ یارائے کلام قتیل لکھنوی اور غیاث الدین ملائے مکتبی رام پوری کی قسمت کہاں سے لاؤں کہ تم جیسا شخص میرا معتقد ہو اور میرے قول کو مستند سمجھے" (بنام چودھری عبدالغفور سرور)

(۵) قتیل کو ایطائے جلی و خفی کی صحیح تعریف معلوم نہ تھی۔ غالب فرماتے ہیں:-

"اگر مطلع میں آ پڑے تو ایطائے جلی ہے اور اگر غزل یا قصیدہ میں بطریق تکرار قافیہ میں آ پڑے تو ایطائے خفی .... اصل فارسی کو اس کھتری بچے قتیل علیہ ما علیہ نے تباہ کیا۔ رہا سہا غیاث الدین رامپوری نے کھو دیا۔ ان کی قسمت کہاں سے لاؤں کہ صاحب عالم کی نظر میں اعتبار

پاؤں خالصاً للہ غور کرو کہ وہ خزان ناشخص کیا کہتے ہیں اور میں خستہ و دردمند کیا بکتا ہوں ۔ واللہ نہ قتیل فارسی شعر کہتا ہے۔ اور نہ غیاث الدین فارسی جانتا ہے۔ میرا یہ خط پڑھو۔ یہ نہیں کہتا کہ خواہی نخواہی پڑھو۔ قوت ممیزہ سے کام لو۔ ان غولوں پر لعنت کرو سیدھی راہ پر آجاؤ۔ اگر نہیں آتے تو تم جانو۔ تمھاری بزرگی پر اور مرزا تفتہ کی نسبت پر نظر کر کے لکھا ہے۔ نہیں کہتا کہ خواہی نہ خواہی میری تحریر کو مانو۔ مگر اس کھتری بچہ اور اس معلم سے مجھ کو کمتر نہ جانو" (بنام صاحب عالم صاحب)

(۶) قتیل کا اجتہاد ہے کہ ہمہ کے لفظ کو جمع کے ساتھ لاؤ، مفرد سے نہ ملاؤ۔ ہمہ عالم۔ ہمہ روز۔ ہمہ جا غلط ہے۔ مرزا غالب فرماتے ہیں:۔

" منشائے اعتراض یہ ہے کہ عالم مفرد ہے اسکا ربط ہمہ کے ساتھ بحسب اجتہاد قتیل ممنوع ہے۔ قضارا اس زمانے میں شاہزادہ کامران درانی کا سفیر گورنمنٹ میں آیا تھا کفایت خاں اس کا نام تھا۔ اس تک یہ قصہ پہنچا۔ اس نے اساتذہ کے پان سات شعر ایسے پڑھے جس میں ہمہ عالم وہمہ روز وہمہ جا مرقوم تھا۔ اور وہ برہان قاطع میں مندرج ہیں" (بنام مولوی عبدالرزاق شاکر)

(۷) مرزا قتیل نے لکھا ہے کہ جامہ گذاشتن بمعنی مُردن گو صحیح ہے لیکن موقعہ دیکھ کر اور احتیاط سے استعمال کیا کرو۔ مرزا غالب فرماتے ہیں:۔

" کالپی کے نواب زادوں میں سے ایک صاحب قتیل کے شاگرد تھے۔ میں نے ایک رقعہ قتیل کا ان کے نام دیکھا ہے۔ قتیل ان کو لکھتا ہے کہ جامہ گذاشتن بمعنی مُردن مسلم لیکن بہت احتیاط کیا کرو۔ موقعہ دیکھ لیا کرو

جب لکھا کرو۔ میں کہتا ہوں کہ احتیاط کیا اور موقعہ کہا" (بنام چودھری عبدالغفور سرور)

(۸) مرزا قتیل کا شعر ہے

یک وجب صباے بکوئے تو ز خون پاک نبود + کشتہ بر کشتہ تپاں بود گر خاک نبود

اس میں ہیچ نہ بود کی جگہ خاک نہ بود لکھا ہے۔ اُردو محاورے کا ترجمہ ہے فارسی میں اس طرح نہیں بولا جاتا۔

مرزا غالب کہتے ہیں :-

"ہندی میں کچھ نہیں کی جگہ خاک نہیں بولتے ہیں۔ فارسی میں ہیچ نیست کی جگہ خاک نیست کوئی نہیں کہے گا قتیل چاروں خانے چت گرا۔ ع کشتہ بر کشتہ تپاں بود گر خاک نہ بود۔ یعنی ہیچ نہ بود۔ لاحول ولا قوۃ" (بنام قدر بلگرامی)

اعتراضات کے جواب یہ ہیں وہ آٹھ اعتراضات جو مرزا غالب نے مرزا قتیل پر وارد کئے ہیں۔ ان کے علاوہ مجھے باوجود تلاش کوئی اور ایسا اعتراض نہ مل سکا جو مرزا غالب نے قتیل پر کیا ہو۔ اب ہم ان کو بالترتیب جانچیں تولیں گے۔

(۱) قتیل اساتذہ کے کلام سے آشنا نہیں۔ مرزا غالب نے اپنے اس اعتراض کی کوئی وجہ یا کوئی ثبوت نہیں دیا ہے۔ خبر نہیں انھوں نے یہ نتیجہ کیونکر نکالا۔ مرزا قتیل کی تصانیف عام طور سے اس وقت ملتی تھیں اور اگر مرزا غالب اس "حسن ظن" سے کام نہ لیتے اور واقعی مرزا قتیل کی کتابوں کو ایک نظر دیکھ جاتے تو یقیناً یہ ان کے لئے مفید ہوتا۔ اس الزام اور اتہام کے بارے میں سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے

کہ اہلِ انصاف آج بھی مرزا قتیل کی کتابوں خصوصاً شجرۃ الامانی، چار شربت اور نہر الفصاحت کو دیکھ لیں اور خود فیصلہ کریں۔ میرا خیال ہے کہ صرف چار شربت ہی میں اس قدر مصالحہ ہاتھ آجائے گا کہ پھر مجھے تردید کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ اگر تطویل لاطائل کا خوف نہ ہوتا تو میں حوالے دیکر عرض کرتا کہ مرزا قتیل نے شاید ہی اساتذہ متقدمین و متاخرین میں سے کسی کو فراموش کیا ہو۔ نظم و نثر فارسی پر جس قدر ان کو عبور حاصل تھا وہ واقعی حیرت میں ڈالتا ہے۔ مرزا قتیل کی کتابیں گذشتہ صدی کی فارسی کی صرف و نحو۔ صنائع بدائع زبان دانی کی بہترین کتابوں میں سے ہیں۔ انھوں نے ایران کے مختلف حصّوں کی زبان اور محاورے کو کماحقہ سمجھا اور بتایا ہے۔ اور اساتذہ کے کلام اور تحریرات سے جس قدر اسناد کیا ہے اس کا جواب مشکل سے ملتا ہے۔ ان کی کتابوں کے علاوہ بھی اس کا کافی ثبوت موجود ہے کہ قتیل اساتذہ کے کلام سے نہ صرف واقف تھے بلکہ اس کا بیشتر حصہ ان کو مستحضر تھا۔ اور انھی کی تحریک و تائید سے فارسی شعراء کے کم از کم دو موقر و مستند تذکرے لکھے گئے۔ احمد علی ہاشمی نے "تذکرۂ مخزن الغرائب" تین جلدوں میں لکھا۔ احمد علی ہاشمی خود بھی جہاندیدہ آدمی تھے۔ چالیس سال کے قریب علما اور ادبا کی صحبتوں میں گذارے تھے۔ کہتے ہیں "شب و روز در یک جا با مردم خراسان و عراق و فارس صحبت گرم می داشتم تا از برکت صحبت فیض و مجالست ایشان بے بہرہ نماندم کم و بیش پے بمحاورہ فارسی بردم و در میان سیاہ و سفید فرق توانستمی کرد"[۱] ۔ مخزن الغرائب کا سبب

---

[۱] دیباچہ تذکرہ مخزن الغرائب جلد اول۔ نسخہ قلمی موجودہ لائبریری ریاست حبیب گنج نمبر ۵۱/۱

تالیف اس طرح بیان کرتے ہیں " استادی افصح الفصحا روا کمل البلغا، مرزا محمد حسن المتخلص بہ قتیل کہ واقعی کشتۂ راہ دوست است ورضاعت براعت کلام اگر رئیس شیروان زندہ بودے بشاگردیش اقرار نمودے و درجزالت وسلاست عبارت اگر حکیم خاوراں زندہ گشتے بملک الشعرائے او را برداشتے دفصاحت و بلاغت کسب کردے فرمود کہ اشعار از ہر قسم بسیار بہم شدہ اگر بطرز تذکرہ وطرق تہجی رعایت کردہ آید چہ کہ خوانندۂ ایں باسانی ہر کدام شاعر را کہ بخواہد اشعارش برآوردہ بخواند. بصواب نزدیک تراست بحسب فرمودۂ آں وحید عصر ایں جواہر زواہر بطرق تہجی دررشتہ تحریر کشیدہ آمد" اسی طرح مصحفی کا تذکرہ عقد ثریا بھی مرزا قتیل کی تحریک پر ہی لکھا گیا. بدقسمتی سے جو نسخہ حال میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہوا ہے. اس میں وہ تمام تفصیلات شامل نہیں ہیں جو اس کے دوسرے قلمی نسخوں میں پائی جاتی ہیں. مولوی عبدالمالک صاحب آروی نے پٹنہ اورنٹیل لائبریری کے مخطوطے کے حوالے سے لکھا ہے کہ "مصحفی نے دیباچہ میں اس کی تصریح کردی ہے کہ مرزا محمد حسن قتیل کی ترغیب سے انھوں نے عقد ثریا کی ترتیب دی. بہت سا مواد بھی مرزا قتیل ہی نے دیا[۹]" . مرزا غالب کا یہ کہنا کہ قتیل اساتذہ کے کلام سے ناآشنا تھے دعوئے بے دلیل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا

(۲) مرزا قتیل نے تحریر کو تقریر جیسا بنا دیا۔

یہ بھی کچھ عجب اعتراض ہے. خود مرزا غالب پنج آہنگ میں یہ تسلیم

---

۹ رسالہ نگار. فروری ۱۹۴۹ء. صفحہ ۱۰

فرماتے ہیں :-

"نگارش را از گذارش دور تر نبرده رنگ گفتن دہد مطلب را بداں روش گذارد کہ دریافتن آں دشوار نہ بود"

غالب کا اعتراض یہ ہے کہ "جام کی جگہ جامک نہ لکھو۔ یہ طرز قتیل کی ہے کہ وہ ایرانیوں کی تقریر کے موافق تحریر بناتا ہے" (بنام قدر بلگرامی) اول تو یہ کہیں ثابت نہیں کہ مرزا قتیل نے کہیں جام کو جامک یا جا مگی لکھا ہو۔ مرزا غالب نے خواہ مخواہ مرزا قتیل پر منڈھ دیا ہے۔ اور یہ ان کا معمول تھا کہ جہاں غلط فارسی دیکھی اور انھوں نے قتیل پر الزام رکھا[۱] اس کے علاوہ خود مرزا بھی اس قسم کے تصرفات سے نہیں بچ سکتے۔ مرزا تفتہ کو ایک دفعہ اصلاح دی اور "تازہ نگاہ" کی جگہ "نیم نگاہ" بنایا۔ اس سے شاید تفتہ مطمئن نہ ہوئے اور سند مانگی اس پر مرزا غالب فرماتے ہیں "نیم نگاہ و نیم گناہ و نیم ناز یہ روزمرہ اہل زبان ہے۔ نیم بمعنی اندک ورنہ گناہ کا آدھا اور نگاہ کی ادھواڑ اور ناز آدھا یہ مہملات ہیں۔ ان چیزوں کا مناصفہ کیا۔ اگر تم کو نیم نگاہ پسند تازہ نگاہ رہنے دو"

---

[۱] مثلاً قاضی عبدالجمیل صاحب نے مرزا غالب کو خط لکھا اور اس میں مرزا کا وہ قطع جس کو وہ اپنی وفات کی تاریخ بتاتے تھے نقل کیا۔ پہلا مصرع انھوں نے اس طرح سے لکھ دیا ع کیستم من کہ تا ابد بزیم۔ (اس پر مرزا غالب لکھتے ہیں:- لاحول ولا قوۃ۔ یہ مصرع میرا نہیں "تا ابد بزیم" یہ فارسی لا قتیل کی ہے۔ میرا قطع یہ ہے ع کیستم من کہ جاوداں باشم ۔۔۔ الخ"

خود مرزا غالب نے اپنی اُردو رقعہ نگاری کی تعریف یہی کی ہے کہ "مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا" پھر اگر یہی خوبی مرزا قتیل نے پیدا کی تو کون گناہ کیا۔ مرزا غالب یہ بھی فرماتے ہیں کہ خواجہ وطواط شرف الدین علی یزدی، ملا حسین واعظ کاشفی اور طاہر وحید نے نثر میں خون جگر کھایا ہے اگر قتیل کی طرز جو انھوں نے بہ تقلید اہل ایران نکالی مستحسن ہوتی تو یہ سب بھی ایسی ہی نثریں لکھتے۔ یہ بھی عجیب استدلال ہے کہ چونکہ ایک شخص پرانی طرز تحریر کی کورانہ تقلید نہیں کرتا اور قواعد میں رہتے ہوئے اپنے لئے ایک نئی راہ نکالتا ہے تو وہ مردود۔ اور پھر یہ استدلال مرزا غالب کی جانب سے تو عجب ستم ظریفی اپنے اندر رکھتا ہے۔ مرزا غالب جو ادب میں اصلاح کے علمبردار اور اندھی تقلید کے سب سے بڑے دشمن سمجھے جاتے ہیں وہی کہہ رہے ہیں جس کے خلاف کہا جاتا ہے کہ انھوں نے جنگ بغاوت کا اعلان کر رکھا تھا۔ اصل میں مرزا غالب خود ہی جہاں تک ان کے ارادے کا تعلق ہے پرانی لکیر کے فقیر تھے۔ وہ بھی قدما کی طرح فارسی میں اپنی تحریروں کو جان جان کر مشکل بنانا پسند کرتے تھے۔ اس میں ان کو بڑا مزا آتا تھا کہ آسانی سے ان کی بات سمجھ میں نہ آئے گویا ان کی بات آسانی سے سمجھنا ایک جرم تھا۔ اور اس میں وہ اپنی اہانت سمجھتے تھے مشکل مطالب کو ثقیل اور نامانوس الفاظ میں صنائع بدائع کے زیور سے آراستہ کر کے پیش کرنا ہی وہ اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے۔ اور اس طریقہ سے پڑھنے والے پر وہ اپنا سکہ جمانا چاہتے تھے۔ وطواط، طاہر وحید ظہوری۔ ابوالفضل اور بیدل کا بھی یہی انداز ہے۔ ہر چند کہ رنگ ہر ایک کا الگ الگ ہے مگر اشکال ب

ہیں مشترک ہے۔ مرزا غالب کی فارسی نثر کی دونوں کتابیں (مہر نیمروز اور دستنبو) اسی قبیل کی کتابیں ہیں اور سچ یہ ہے کہ ان پر پیمانے کی مثل بالکل صادق آتی ہے کہ چھلکے ہی چھلکے ہیں مغز کا نام نہیں۔ وہ تو یوں کہیئے کہ بلا ارادہ جو اُردو کے خطوط انھوں نے لکھے ان کی وجہ سے مرزا غالب کی نثر نگاری کی یہ تعریفیں ہیں یہ خطوط انھوں نے قطعی سرسری طور پر اور بغیر اس علم کے لکھے تھے کہ کسی وقت یہ شائع بھی ہوں گے اور اسی لئے وہ ان کو چھپوانے کے شروع شروع میں مخالف بھی تھے۔ خود کہتے ہیں "کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا۔ ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کی منافی ہے۔" لیکن یہی تحریر سرسری ان کی شہرت کا باعث ہے۔ ورنہ وہ ارادے سے ایسا لکھنے کے اہل ہی نہ تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ فیصلہ کرنے کے بعد کہ رقعات چھپوائے جائیں گے اور جو رقعات انھوں نے اس نیت سے لکھے کہ وہ اس مجموعے میں شامل ہوں وہ پہلے رقعوں کے مقابلے میں بہت کم درجے کے ہیں[۹۱]۔ اس کے علاوہ جب مسٹر اسٹورٹ ریڈ نے مرزا سے اُردو قصہ لکھنے کے لئے کہا تو اس اُردو نثر کے موجد سے ایک قصہ نہ لکھا گیا۔ لکھتے ہیں:۔

"جناب ریڈ صاحب مجھ سے کیا) کرتے ہیں میں اُردو میں اپنا کمال کیا ظاہر کر سکتا ہوں۔ اس میں گنجائش عبارت آرائی کی کہاں ہے" (بنام منشی شیو نراین)

"میاں اُردو کیا لکھوں۔ میرا یہ منصب ہے کہ مجھ پر اُردو کی فرمائش ہو" (بنام منشی شیو نراین)

---

۹۱ مثلاً رقعہ بنام مرزا رحیم بیگ صاحب ساطع برہان

"بھائی تم غور کرو آردو میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کروں گا اور اس عبارت میں معانی نازک کیونکہ بھروں گا" (بنام منشی شیونراین)

غرضکہ یہ بالکل یقینی بات ہے کہ مرزا کا اپنا رنگ وہی اشکال اور تصنع کا رنگ تھا جس میں چھلکے کے علاوہ مغز کا نام نہ ہو۔ اور یہ جو آردو کے رقعے لکھے گئے جو انکی شہرت کا باعث ہوئے وہ مطلق بے ارادہ بلکہ خلاف ارادہ تحریر کا نمونہ ہیں۔ مختصر یہ کہ مرزا غالب اسی دقیانوسی طرزِ تحریر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور وہ قتیل کی تحریر کی کماحقہٗ قدر کرہی نہیں سکتے تھے قتیل کی سادگی تحریر بالارادہ تھی نہ بوجہ عجز۔ چار شربت میں جہاں انھوں نے نثر کی اقسام ثلثہ بتائی ہیں وہاں عاری کی تعریف اس طرح کرتے ہیں " عاری عبارت از نثرے باشد کہ از وزن و قافیہ و دیگر تکلفات معری بود و ایں بسیار مشکل است آسان نیست۔ بیشتر صاحبان دریں مقام عاجز اند"[۹۷] خود مرزا غالب بھی سہل ممتنع (جو عاری ہی کی ایک قسم ہے) کی مشکلات سے پوری طرح واقف تھے۔ چودھری عبدالغفور سرور کے نام کے رقعہ میں فرماتے ہیں" سعدی کی طرز نے بسبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا" پھر کہتے ہیں"سہل ممتنع اس نظم و نثر کو کہتے ہیں کہ دیکھنے میں آسان نظر آئے اور اس کا جواب نہ ہوسکے" یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اپنے لئے سادہ طرز کا انتخاب مرزا قتیل نے بچت اور آسانی کے خیال سے کیا تھا۔ چار شربت ہی میں انھوں نے ہر سہ اقسام نثر (عاری۔ مسجع۔ مرجز) میں فاضلانہ۔ صوفیانہ و منشیانہ طرز تحریر کی بسیط

---

[۹۷] چار شربت صفحہ ۵۹

مثالیں دی ہیں ۔ پھر اس کے بعد وصاف ۔ شرف الدین علی یزدی ۔ خواجہ محمود گیلانی ۔ ابوالفضل ۔ ظہوری ترشیزی ۔ مرزا عبدالقادر بیدل، طاہر وحید اشرف ۔ مرزا مہدی اور منشی صاحب عالم کی طرز تحریر کو بالتفصیل بتایا ہے کہ ان میں کیا کیا خصوصیات ہیں اور پھر ہر ایک کی طرز میں مثالاً ایک ایک مفصل عبارت لکھی ہے[۹۱] ۔ پھر یہ دکھا کر کہ ان کا قلم ان سنگلاخ وادیوں سے یکساں روانی کے ساتھ گذرنے پر قدرت رکھتا ہے انھوں نے اپنے لئے سادہ طرز تحریر پسند کی ۔ اور یہی اس کی انتہائی تعریف ہے ۔ شیخ رحمت اللہ ثمراۃ البدائع کے دیباچہ میں لکھتے ہیں ۔

" رقعاتش (رقعات قتیل) چوں دلق سالکان مسالک تجرید از آرائش تکلف مبرا است وشاہدان سبز فام فقراتش بسان اسرار رہ نمایان طرق توحید ہوش ربا وحیرت افزا شگفتہ گردید[۹۲] "

اصل میں یہ جو سادگی اور برجستگی غالب کے اُردو رقعوں میں پائی جاتی ہے (اور جس کو وہ فارسی میں پیدا نہ کر سکے) وہی فارسی میں قتیل کی خصوصیت ہے ۔ یہ بڑے تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ غالب جن کی شہرت بحیثیت ایک نثر نگار ان کے اُردو کے رقعات کی سادگی اور بے ساختگی پر موقوف ہے وہ قتیل کی نثر پر انہی خصوصیات کے موجود ہونے کی بنا پر اعتراض کریں ۔

---

۹۱ چار شربت صفحہ ۵۹ تا ۶۰

۹۲ ثمراۃ البدائع صفحہ ۲

(۳) قتیل کے بقول کدہ کا لفظ صرف پانچ اسمار سے ترکیب پاتا ہے۔

مرزا غالب نے اپنے خطوط میں متعدد جگہ بڑے بڑے اور اکثر بُرے بُرے الفاظ کے ساتھ مرزا قتیل کی یہ "غلطی" ظاہر کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس اجتہاد کی بنا پر نشتر کدہ وغیرہ غلط ٹھیرتے ہیں گو یہ ترکیبیں متقدمین و متاخرین نے بکثرت استعمال کی ہیں۔ افسوس کہ مرزا غالب نے یہاں بھی حسب معمول بغیر حوالہ دئے اور بغیر تحقیق کئے اعتراض جڑ دیا۔ خبر نہیں مرزا غالب کو اس طرح مبتدیوں کی طرح آدھی ادھوری باتوں پر اعتراض کر بیٹھنے میں کیا لطف آتا تھا۔ محض مذاح کے لئے ایسا ہو تو خیر جائز ہے۔ مثلاً انکا وہ قطعہ ہے

بہ خاست است گرد ز سر چشمۂ حیات | در حافظہ نماند مے در سبو مرا
لا تقربوا الصلوٰۃ نہ نہیم بخاطر است | وز امر یاد ماندہ کلوا واشربوا مرا

لیکن جب سنجیدہ گفتگو اور معاندانہ دمخالفانہ تحریر ہو تو یہ ادچھے تیر اکثر الٹے پڑتے ہیں کدہ کی بحث مرزا قتیل نے نہر الفصاحت صفحہ ۲۵ پر کی ہے۔ مرزا غالب کے اعتراض کا جواب شاید اس سے بہتر ممکن نہ ہو کہ میں نہر الفصاحت کی اصل عبارت معہ تشریح ناظرین کے سامنے رکھ دوں۔ مرزا قتیل کہتے ہیں :-

دیگر کدہ بمعنی خانہ باشد با پنج لفظ ملحق شدہ سوائے آن مسموع نیست بت کدہ و غم کدہ و آتش کدہ و مے کدہ و گلشن کدہ وغیر آں چوں آب کدہ نمی دانم کہ درست است یا نا درست۔ ف یعنی ایں ہا اصول اند و سوائے ایں

پنج آنچہ در کلام اساتذہ یافتہ باشد فروع این ہا باشد۔ حصر مقصود نیست و فروع دراصل داخل است چوں حیرت کدہ و سنبل کدہ و ویران کدہ و حسرت کدہ و ماتم کدہ وراحت کدہ و تغافل کدہ و جہنم کدہ و بہشت کدہ و ہر دو در گلشن کدہ داخل است چراکہ گلشن جائے گل معنی بود و ماتم کدہ و عشرت کدہ و تحت غم کدہ داخل اند اول مرادف بمعنی دوئم بسبب ضد بودن۔ نظر بر نظیر است۔"

(۴) مرزا قتیل نے اقسام نثر کی تعریف میں غلطی کی

یہ اور اس سے اگلا اعتراض مرزا غالب کی علمیت کو ضرورت سے زیادہ عریاں کئے دیتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی بھی سمجھ دار آدمی کیونکر اس معاملے میں اس انداز سے نکتہ چینی کر سکتا تھا۔ لطف تو یہ ہے کہ مرزا غالب نے جو تعریف اقسام نثر کی کی ہے اور اپنے نزدیک قتیل کو اصلاح دی وہ غلط ہے اور مرزا قتیل کی تعلیم صحیح۔ لیکن پھر بھی مرزا غالب نے اس قدر سختی اور درشتی سے مرزا قتیل کا ذکر اس ضمن میں کیا ہے کہ معاذ اللہ۔ کھتری بچہ، خرناشخص وغیرہ سب ہی کچھ کہہ ڈالا۔ میرا خیال ہے کہ اس زور شور کی وجہ یہی تھی کہ مرزا اس جگہ بالکل ہی ضعیف بنیادوں پر تھے۔ اور ان کو خود اس کا احساس تھا دلیل کی کمزوری کو وہ گفتگو کی تیزی اور تلخی سے پورا کرنا چاہتے تھے۔ اور سائل کو مطمئن نہیں بلکہ مرعوب کر دینا چاہتے تھے۔ یہ ایک نہایت دلچسپ نفسیاتی مسئلہ ہے۔ دکاندار اپنی دکان کی ناکارہ اور کم حیثیت چیز کی سب سے زیادہ تعریف کرتا ہے تاکہ بکے۔ اچھی چیزیں تو خود بخود بک ہی جاتی ہیں۔ یہی صورت مرزا غالب کی تھی۔ قصہ یہ ہوا کہ چودھری عبدالغفور سرور اور صاحب عالم صاحب نے نثر کی اقسام ثلثہ دریافت کیں۔ مرزا غالب نے لکھا

"وزن نہ ہو قافیہ ہو وہ مقفیٰ۔ وزن ہو قافیہ نہ ہو وہ مرجز ہے۔ الفاظ فقرتین وزن میں برابر ہوں وہ مسجع۔ اس صنعت کو بیشتر نثر مقفیٰ میں صرف کرتے ہیں۔ اور جا ہو قافیہ کا التزام نہ کرو۔" یہ تعریف چودھری صاحب و صاحب عالم صاحب کو مطمئن نہ کر سکی انھوں نے قتیل کی بتائی ہوئی تعریف لکھی ہوگی جس پر غالب چراغ پا ہو گئے۔ اب آئیے دیکھیں مرزا قتیل نے کیا تعریف کی ہے اور ان میں کونسی صحیح ہے۔ مرزا قتیل نے چار شربت صفحہ ۵۹ پر اقسام ثلثہ نثر اس طرح بیان کی ہیں۔ "نثر را سہ گونہ بنا گذاشتہ اند، عاری و مسجع و مرجز۔ عاری عبارت از نثرے باشد کہ از وزن و قافیہ و دیگر تکلفات معریٰ بود .... و مسجع نثریست کہ آخر فقرۂ آں لفظے آرند و مقابل آں لفظ در فقرہ دیگر لفظے باشد کہ در روی و ردف و ردفین و تاسیس و دخیل و حرف وصل و غیرآں موافق بایں لفظ باشد (یعنی ہم قافیہ ہو) و مقید بوزنے نہ بود۔ و مرجز نثرے باشد کہ از قافیہ پاک بود اما فقرۂ اولیٰ با فقرۂ ثانی مساوی الوزن باشد" یعنی عاری وہ جس میں نہ وزن نہ قافیہ، مسجع وہ جس میں وزن نہ ہو قافیہ ہو۔ اور مرجز وہ جس میں قافیہ نہ ہو وزن ہو۔ یہی اقسام ثلثہ نثر ہیں۔ اب اس کا مقابلہ مرزا غالب کی بتائی ہوئی تعریف سے کیجئے۔ مرجز کی تعریف تو دونوں کی ایک سی ہے۔ عاری مرزا غالب نے اس جگہ بتائی ہی نہیں۔ اس کو جانے دیجئے۔ اب سوال مسجع کا ہے۔ اہل نظر سے پوشیدہ نہ ہوگا کہ مرزا غالب کی بتائی ہوئی تعریف مسجع کی غلط ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ مسجع اور مقفیٰ میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن یہاں مرزا غالب نے کہا ہے کہ "مسجع وہ جس میں الفاظ فقرتین وزن میں برابر ہوں اور خواہ قافیہ نہ ہو" پھر بتائیے کہ

اس میں اور مرجز میں کیا فرق رہ گیا۔ مرجز کو مرزا غالب نے بھی لکھا ہے کہ وزن ہو قافیہ نہ ہو۔ مرزا غالب کی بتائی ہوئی مسجع میں جب الفاظ فقرتین وزن میں برابر ہوں گے تو فقرتین بھی یقیناً ہم وزن ہوں۔ اجزا جب ہم وزن ہیں تو کل آپ سے آپ ہم وزن ہوں گے۔ قافیہ کو مرزا غالب مسجع کے لئے ضروری نہیں سمجھتے۔ پھر یہی تعریف وہ مرجز کی بتلاتے ہیں۔ تو دونوں قسموں میں فرق کیا رہا۔ یہاں یہ ماننے بغیر چارہ نہیں کہ مرزا غالب نے مسجع کی تعریف غلط کی۔ مسجع کے لئے وزن کی شرط نہیں صرف قافیہ کی شرط ہے۔ یعنی مقفیٰ اور مسجع ایک ہی ہیں۔ اگر مرزا غالب کا حافظہ اس معاملے میں اس قدر کھویا ہوا نہ ہوتا تو ان کو یاد آجاتا کہ وہ خود اس چیز کو اس طرح بتا چکے ہیں۔ چودھری عبدالغفور کے نام ہی ایک اور خط میں لکھتے ہیں " بندے کی تحقیقات یہی ہے کہ نثر تین قسم پر ہے۔ مقفیٰ قافیہ ہے وزن نہیں۔ مرجز وزن ہے اور قافیہ نہیں۔ عاری نہ وزن ہے نہ قافیہ۔ مسجع ہی مقفیٰ ہے۔" اب اس تعریف کو دیکھئے تو بالکل وہی ہے جو مرزا قتیل نے کی ہے۔ پھر مسجع کی غلط تعریف کرکے اور مرزا قتیل سے اختلاف نکال کر ان بے چارے کو خواہ مخواہ مورد الزام کرنا لیکن اصلیت میں خود اپنی ہنسی اڑوانی کیا ضرور تھی۔

(۵) قتیل نے ایطائے جلی و خفی کو سمجھانے میں غلطی کی۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے مرزا غالب اس معاملے میں خواہ مخواہ بے چارے مرزا قتیل کے پیچھے پڑ گئے۔ اور ان غول۔ کھتری بچہ، علیہ ما علیہ سب کچھ کہہ ڈالا۔ یہاں بھی معاملہ یہ تھا کہ انھوں نے صاحب عالم صاحب کی درخواست پر قافیہ لشاں گان اور خفی اور جلی کا فرق سمجھایا۔ اور جب صاحب عالم صاحب کو

اطمینان نہ ہوا اور انھوں نے قتیل کا غالباً حوالہ دیا تو بس مرزا غالب بگڑ گئے اب آیئے دیکھیں ان حضرات نے کیا کیا فرمایا ہے اور قتیل مرحوم کی کیا ایسی غلطی ہے جس کو مرزا غالب برداشت نہ کر سکے۔

مرزا قتیل نے حسب عادت مختصر لیکن جامع تعریف اس طرح کی ہے:-

"ایطا جلی باشد و خفی۔ جلی آنست کہ عیاں باشد و در کلام قدما ر بیشتر است و متاخران بے خبر از فن نیز آوردہ اند و پاکسانیکہ در جمیع مراتب شعر تقلید متقدماں پیش نہاد خاطر شان بودہ مثل شیخ محمد علی حزیں علیہ الرحمۃ رمی گوید ؎

(اشک کباب ام از دلِ سوزاں فرد چکم ٭ خون دلم ز دیدۂ گریاں فرد چکم)

ایطائے خفی آن بود کہ زود تر دریافت نشود تا اندکے تامل در آن نہ کنند مانند آب و گلاب و ایں قافیہ را معیوب شمار نہ کردہ اند۔ و نزد نقیر ہیچ گونہ در مطلع جواز ندارد[۱]"

مرزا غالب فرماتے ہیں:-

"اہلِ خرد نے خاک اڑائی ہے اور بات بنائی ہے خفی اور جلی کی تفسیر میں وہ کچھ لکھا ہے کہ صاحب طبع سلیم کبھی اس کو نہ سمجھے چہ جائیکہ ملنے .... اگر یہ (ایطا) مطلع میں آپڑے تو ایطائے جلی ہے اگر غزل یا قصیدہ میں بطریق تکرار قافیہ میں آپڑے تو ایطائے خفی ہے" (نامۂ صفا، عامۂ صبا؟)

---

[۱] چار شربت صفحہ ۲۸ و ۲۹

یہ تو شاید اب کہنے کی بھی ضرورت نہ رہی کہ مرزا غالب کی یہ تعریف ناقص ہے۔ مرزا غالب نے جلی و خفی کی تقسیم اس پر منحصر کی ہے کہ ایطا کہاں وارد ہوتا ہے۔ خود الفاظ کی ساخت اور تشکل سے بحث نہیں، محض اس کے محل استعمال سے غرض ہے۔ گویا یہ ممکن ہے کہ ایک ہی قسم کا ایطا اگر مطلع میں آئے تو اس کو ایطائے جلی کہیں۔ اور پھر اسی کو اگر وہ اشعار مابعد میں بطریق قافیہ آئے تو ایطائے خفی۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ بعض قوافی ایطائے جلی مانے گئے ہیں اور بعض خفی۔ خواہ ان کا محل استعمال کہیں ہو۔ مطلع میں یا درمیان میں۔ جیسا کہ مرزا قتیل نے بتایا ہے۔ خود مرزا غالب بھی عملاً اس کے قائل تھے۔ مرزا تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"حضرت اس غزل میں پروانہ و پیمانہ و بت خانہ تین قافیے اصلی ہیں۔ دیوانہ چونکہ علم قرار پاکر ایک لغت جداگانہ مشخص ہو گیا ہے اس کو بھی قافیہ اصلی سمجھ لیجئے۔ باقی غلامانہ و مستانہ و مردانہ و زرکانہ و دلیرانہ و شکرانہ" سب ناجائز اور نامستحسن۔ ایطا اور ایطا بھی قبیح" (یعنی ایطائے جلی)

ظاہر ہے کہ یہ سب قافیے مطلع ہی میں تو استعمال نہ کئے گئے ہونگے۔ بلکہ غزل کے دیگر اشعار میں بطریق تکرار قافیہ میں آئے ہوں گے۔ لیکن ان کو مرزا غالب ایطا قبیح فرماتے ہیں۔ یعنی بالفاظ دیگر ایطائے جلی۔ اور یہی ٹھیک بھی ہے۔

(۲) قتیل "ہمہ عالم" "ہمہ جا" "ہمہ روز" وغیرہ کی ترکیب کو غلط بتاتے ہیں:۔

اس اعتراض اور اس معرکے کی تفصیل ہم صفحہ ۳۳ تا ۳۷ پر دے چکے ہیں۔ اس بحث کے دو پہلو ہیں۔

(i) کیا قتیل نے "ہمہ عالم" وغیرہ ترکیب کو غلط بتایا۔
(ii) کیا واقعی یہ ترکیب غلط ہے۔

ہم نے دانستہ یہ دو تنقیحیں قائم کی ہیں۔ ہم اشارتاً عرض کر چکے ہیں کہ مرزا قتیل پر یہ بہتان تھا کہ انھوں نے اس ترکیب کو غلط بتایا ہے ورنہ معترضین کی افترا پردازی کے علاوہ اس کی کوئی اصلیت نہیں۔ جہاں تک ہمیں پتہ چل سکا مرزا قتیل نے ۸ کتابیں لکھی ہیں[91]۔ ہم نے حتی المقدور ان سب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اور ہمیں یہ کہنے میں مطلق پس وپیش نہیں کہ مرزا مرحوم نے کہیں اس ترکیب کو ناجائز نہیں بتایا۔ نہ صرف یہی بلکہ خود مرزا قتیل نے یہ تراکیب استعمال کی ہیں۔ نثر میں فرماتے ہیں:-

"ہر گاہ می دانید کہ ہمہ جا بر روئے زمین ہمیں آرمیانند"[92]

نظم میں بھی مرزا قتیل نے یہ تراکیب استعمال کی ہیں ؎

تیغ برکش، دست بکشا، چیست بیم از روزِ حشر
گر دو عالم را بریزی خوں نگاہے خون بہاست[93]

ایک غزل اسی ترکیب کی زمین میں لکھی ہے جس کے دو شعر یہ ہیں ؎

---

[91] ان کے علاوہ ایک فارسی قصہ اور ایک ترکی خطوط کے مجموعہ کا اور پتہ چلتا ہے، وہ ہم نے نہیں دیکھے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان میں فارسی قواعد کا کیوں ذکر ہوگا۔

[92] یہ محض مثالاً لکھا گیا ہے ورنہ انکی کتابوں میں ایسی ترکیبیں ہزاروں اور مل سکتی ہیں۔

[93] یہاں اگرچہ ہمہ عالم نہیں ہے لیکن اعتراض کی بنا پر دو عالم کی ترکیب غلط ٹھیرتی ہے کیونکہ اعتراض تو یہ تھا کہ ہمہ جمع ہے اور عالم مفرد اس لئے یہ دو ترکیب نہیں پا سکتے۔

سرِ نقش بودو دستِ رقیباں ہمہ شب ؛ من زغم با اجلم دست و گریباں ہمہ شب
مہ من بر سرِ رحم آئے کہ بے چارہ قتیل ؛ می کند نالہ بکوبت چو گدایاں ہمہ شب

پھر یہ کہنا کس قدر ظلم ہے کہ قتیل نے ہمہ عالم ۔ ہمہ روز ۔ ہمہ جا وغیرہ ترکیبوں کو ناجائز بتایا ۔ معترضین غالب نے اپنے اعتراض کو وزنی کرنے کے خیال سے غالباً مرزا قتیل کا نام لے دیا ہوگا ۔ مرزا غالب نے اور تو بہت سے جواب دیئے ۔ لیکن اگر وہ چاہتے تو نہایت مسکت جواب خود قتیل ہی کے شعر سے دے سکتے تھے ۔

اب یہ چیز رہ جاتی ہے کہ ممکن ہے مرزا قتیل نے یونہی زبانی اپنی تعلیمات میں اس ترکیب کو غلط اور ناجائز بتایا ہو ۔ اگرچہ اس فضول سے امکان پر کسی اعتراض کا دار و مدار تو نہیں ہو سکتا ۔ لیکن آئیے یہ بھی دیکھ لیں کہ اگر ایسا تھا تو اس کی کیا صورت ہوگی ۔

"ہمہ" برائے احاطہ افراد یا برائے شمول اجزا آتا ہے ۔ جب برائے احاطہ افراد آئے گا تو ظاہر ہے کہ یہ واحد کے ساتھ ترکیب نہیں کھائیگا مثلاً ہمہ مرداں یا ہمہ چیزہا برخلاف اس کے جب شمول اجزا مقصود ہوگا تو واحد ہی کے ساتھ ترکیب پائیگا ۔ مثلاً ہمہ روز یعنی از صبح تا شام تمام روز ۔ یا ہمہ عالم یعنی تمام عالم ، کل عالم ، لیکن اگر برائے احاطہ جمیع عالمین آیا ہے تو ہمہ عالمہا کہنا ہی ٹھیک ہوگا ۔ یہ مانا کہ بعض صورتوں میں برائے احاطہ افراد بھی "ہمہ" لفظ واحد سے ترکیب پاتا ہے مثلاً ہمہ کس ۔ لیکن یہ مستثنیات میں سے ہے قاعدہ وہی ہے کہ ہمہ برائے احاطہ افراد جمع ہی کے ساتھ ترکیب کھائے اور ایک قواعددان ، صرف و نحو کا استاد قاعدے کو قاعدے ہی کی حیثیت

سے بتا سکتا ہے مگر اس میں مستثنیات بھی لاحق ہوتی ہیں ممکن ہے اس صورت سے مرزا قتیل نے ہمہ کی تشریح زبانی اپنے شاگردوں کو سامنے کی ہو[۹۵]۔ اور اگر ایسا کیا ہو تو یہ قابلِ گرفت نہیں مستثنیات سے قاعدہ غلط ثابت نہیں کیا جا سکتا بالکل ایسے ہی جیسے قاعدے کی رو سے مسلمہ اور متفقہ مستثنیات نہیں بدلے جا سکتے۔ بہر حال اس تعلیم میں (اگر انھوں نے واقعی یہ تعلیم دی ہو) مرزا قتیل یقیناً غلطی پر نہیں تھے۔ یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ انھوں نے یہ ہرگز نہ کہا ہوگا کہ ہمہ کسی صورت سے واحد کے ساتھ ترکیب نہیں پاتا کیوں کہ خود انھوں نے متعدد جگہ اس طرح استعمال کیا ہے۔ پھر صرف کسی کے کہنے سننے پر یہ یقین کر لینا کہ قتیل نے ہمہ عالم وغیرہ کی ترکیب غلط بتائی ہے۔ مرزا قتیل کو ہدف ملامت بنانا اور موقعہ بے موقعہ مذاق اڑانا کہاں تک درست ہے۔

اس کے علاوہ مرزا غالب کا یہ آزمودہ حربہ ہے کہ کسی ایسے ہی استفسار کر کے بےچارے قواعد داں و قواعد نگار کی ہنسی اڑا دیں سید عبدالواسع ہانسوی کو متعدد بار بے نقط سنائیں۔ فرماتے ہیں " وہ

---

۹۵ اس کا مطلق کوئی ثبوت نہیں کہ مرزا قتیل نے ہمہ کے متعلق کچھ بھی کہا ہو۔ لیکن یہ معروضہ ہم اس لئے زیر بحث لائے کہ جب اعتراض ہوا تھا تو لوگوں نے مرزا قتیل کا نام سند میں پیش کیا تھا۔ پھر مرزا غالب مدت تک مرزا قتیل کا مذاق اڑاتے رہے لیکن کسی نے یہ نہ کیا کہ یہ ثابت کر دے کہ مرزا قتیل پر یہ بہتان ہے۔

میاں صاحب ہانسی کے رہنے والے بہت چوڑے چکلے جناب عبدالواسع کہتے ہیں کہ بے مراد صحیح اور نامراد غلط۔ ارے تیرا ستیاناس جائے۔ بے مراد اور نامراد میں وہ فرق ہے جو آسمان اور زمین میں ہے۔ نامراد وہ ہے کہ جس کی کوئی مراد کوئی خواہش کوئی آرزو بر نہ آوے۔ بے مراد وہ ہے کہ جس کا "صفحۂ ضمیر نقش مدعا سے سادہ ہو"۔ حالانکہ جس چیز کو مرزا نے اس بری طرح سے لکھا ہے وہ علم صرف کا ایک نہایت مناسب اور مستند قاعدہ ہے۔ مولوی عبدالباری صاحب آسی کا فیصلہ سنئیے۔

"ملائے ہانسوی کا مقصد کلام یہ ہے کہ "نا" اکثر مشتقات اور صفات پہ داخل ہوتا ہے جیسا کہ نابالغ اور ناممنوع اور بے اسمائے غیر صفت پہ جیسا کہ بے دانش و بے علم و بے شعور و بے زر۔ لیکن حسب قول صاحب فرہنگ اندراج بعض جگہ اس کے برعکس بھی پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ تواں اور امید کہ یہ دونوں لفظ غیر مشتق ہیں اور ان پر حرف نفی خلاف قیاس بجائے بے کے نا داخل ہوتا ہے۔ اور ناتوان اور ناامید کہا جاتا ہے۔ بے تواں اور بے امید مستعمل نہیں ہے۔ جیسا کہ سعدی نے کہا ہے۔

امیدہست پرستندگان مخلص را ۔ کہ ناامید نہ گردد ز آستان اِلٰہ

یا خواجہ حافظ ؎

ہاں مشو ناامید چوں واقف نئی زاسرار غیب ۔ باشد اندر پردہ بازیہائے پنہاں غم مخور

بعض جگہ ایسے مرکبات بھی نظر آئے کہ ایک ہی لفظ پر دونوں لفظ داخل ہوئے ہیں۔ جیسا کہ بے سپاس اور ناسپاس وغیرہ وغیرہ۔

میرے خیال میں ملا عبدالواسع نے جو قاعدہ لکھا ہے وہ صحیح ضرور ہے

اس واسطے کہ قواعد کی اکثر کتابیں اسی کی تائید کرتی ہیں۔ مگر انھوں نے چونکہ مستثنیات کا ذکر نہیں کیا اس لئے مرزا غالب کو اعتراض کا موقع مل گیا۔ ورنہ اصل میں خلاف قیاس اور شاذ کے طریق پر وہ الفاظ واقع ہوئے ہیں جنھیں مرزا نے اپنے واسطے دلیل قاطع سمجھا ہے۔ اور اس قسم کے شاذ الفاظ کی علم صرف میں کوئی انتہا نہیں۔ اس لحاظ سے ملا عبدالواسع پر یہ اعتراض واقع نہیں ہوتا اور چونکہ تمام متقدمین کا اس قاعدہ پر اجماع ہے اس لئے مرزا کی رائے اتنے لوگوں کے مقابلے میں نہیں مانی جاسکتی۔ یہ اور بات ہے کہ بے مراد اور نامراد کے دو خاص معنی آپ کے ہاں ہوگئے ہیں مگر ان پر قاعدے کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔[۹۵]

اس کے علاوہ خود غالب کے زمانے میں اور ان کے ہی دوستوں میں سے یعنی خواجہ غلام غوث بے خبر نے غالب کے اس دعوے اور اس منطق کے خلاف مولانا روم کی مثنوی میں سے تین شعر لکھ کر بھیجے تھے یعنی (۱)

عاقلان از بے مرادیہائے خویش ؎ باخبر گشتند از مولائے خویش

(۲) ع بے مرادی مومناں از نیک و بد

(۳) ع در بکلی بے مرادت داشتے

اس پر غالب نے پہلے شعر کی تاویل کر دی لیکن اگلے دو مصرعوں کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"ان دونوں مصرعوں میں نامراد اور بے مرادی کے معنی میں غلط واقع

---

[۹۵] معرکۂ سخن صفحہ ۱۹۳

ہوگیا ہے۔ خیر بے مراد اور نامراد ایک سہی۔ ہر چند دوسرے مصرعہ مولوی میں بے مراد کے معنی بے حاجت کے درست ہوتے ہیں۔ مگر ع من کہ رندم نتیوہ من نیست بحث + زیادہ تکرار کیا کروں۔ معہذا مصرعہ اول کی کوئی توجیہہ بھی نہیں کرسکتا" (بنام خواجہ غلام غوث)

(۷) مرزا قتیل نے جامہ گذاشتن کے استعمال میں بے وجہ احتیاط کی تلقین کی ہے۔ اگر اعتراضات نمبر ۴ و ۵ میں مرزا غالب نے اپنی "علمیت" کا ضرورت سے زیادہ اظہار کر دیا تھا تو اس اعتراض میں ان کی ذہنیت بالکل عریاں ہوگئی ہے۔ افسوس اور صد افسوس یہ ہے کہ اعتراض کو وقیع بنانے کے لئے انھوں نے غلط بیانی سے کام لیا ہے اور اس کے باوجود اعتراض اس قدر لوچ۔ لچر اور بے بنیاد کیا ہے کہ حد نہیں۔ مرزا غالب نے فرمایا ہے کہ قتیل نے کالپی کے نواب زادوں میں سے کسی ایک کو رقعہ لکھا تھا جو مرزا غالب نے بھی دیکھا۔ اس میں قتیل نے لکھا ہے کہ موقعہ دیکھ لیا کرو جب جامہ گذاشتن کو مُردن کے معنی میں استعمال کیا کرو۔ افسوس اس بیان میں کوئی ایک بات بھی درست نہیں۔ جب پہلی بار انگلستان کی کرکٹ کی ایم۔ سی۔ سی کی ٹیم ہندوستان میں کرکٹ کھیلنے آئی تو یہاں کے اخباروں میں پہلے ہی سے اس ٹیم کے اور اس کے کھلاڑیوں کے حالات اور واقعات چھپنے شروع ہوگئے۔ اس ٹیم میں ایک مسٹر سرتھی تھے۔ ان کے متعلق ہندوستان کے اخبار نے تعارف کرتے ہوئے لکھا کہ "مسٹر سرپہلے بھی ہندوستان میں رہ چکے ہیں۔ وہ ایک رجمنٹ میں کپتان تھے۔ گیند پھینکنے میں ان کو کمال ہے اور وہ گیند الٹے ہاتھ سے پھینکتے ہیں۔" جب ٹیم ہندوستان

اُن پہنچی تو کسی نے مسٹر مرسر کو یہ اخبار کی رپورٹ سنائی اور ان سے تصدیق کا طالب ہوا۔ مسٹر مرسر نے فرمایا کہ " اس بیان کے متعلق مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ میں اب سے پہلے کبھی ہندوستان نہیں آیا۔ میں کسی بھی فوج میں نوکر نہ تھا۔ نہ میں کبھی گیند پھینکتا ہوں نہ سیدھے ہاتھ سے نہ اُلٹے سے۔ اس کے علاوہ اخبار کا بیان حرف بحرف درست ہے"۔ بس یہی حال مرزا غالب کے اس اعتراض کا ہے کہ مرزا قتیل کے جس رقعہ کا وہ حوالہ دیتے ہیں وہ کالپی کے نواب زادے کو نہیں بلکہ خواجہ امامی کو لکھا گیا تھا۔ مرزا غالب نے غالباً دیکھا نہیں تھا۔ اور نہ اس میں جامہ گذاشتن کے متعلق وہ فضولیات ہے جس کا ذکر مرزا غالب نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ مرزا کا اعتراض درست ہے۔

مذکورہ رقعہ مرزا قتیل کے مطبوعہ رقعات میں شامل ہے۔ یہ رقعات عام طور پر غالب کے زمانے میں ملتے تھے۔ پھر انھوں نے کیوں دانستہ یہ غلط بیانی فرمائی یہ سمجھ سے بالا ہے۔ اب آئیے رقعہ کی اصل عبارت کو دیکھیں۔ کہ آخر مرزا قتیل نے کیا کہا ہے۔

"......... دیگر اینکہ در خط شما لفظ جامہ گذاشتن در حق شخصے بود۔ آئندہ مذکور او ہیچ نہ باید نوشت۔ خبر ہائے اراجیف از زبانِ عوام معتبر نیست اگر چیزے دلالت بر عظمت و جبروت او داشتہ باشد مضائقہ ندارد۔ والا ہر چہ ضرور خصوصاً عبارتے کہ در او لفظ جامہ گذاشتن و مثل آن باشد ہیچ صورت مناسب نیست۔ ہر چند ایں اصطلاح را کم کسے می داند لیکن بقرینہ دریافت می تواند شد۔ آئندہ اگر ہیچ چیزے بگوش خورد بہتر انیست کہ ننویسد

چرا کہ اگر اصلے دارد بعد دو روز شما ہم خواہید شنید و اگر دروغ است نوشتن آن خالی از قباحت نیست و ایں ہمہ آنت لم در تصریح نام شخص است۔ اگر بکنایہ باشد ہیچ قباحتے نہ دارد .... یا تمام عبارت در ترکی نوشتن بہتر است کہ احدے بر آن مطلع نمی شود۔[۹۱]

لے لیجئے یہ تھا سارا معاملہ۔ خواجہ امامی نے مرزا قتیل کو کہیں لکھ دیا کہ سنا ہے .... انتقال کر گئے۔ یہ صاحب دربار میں کچھ درجہ رکھتے تھے قتیل نے خواجہ امامی کو جواب میں لکھا کہ اہم آدمیوں کے متعلق محض سنی سنائی باتوں پر بھروسہ کر کے اس طرح نہ لکھ دینا چاہئے۔ اگر کچھ تعریف و توصیف کی بات ہوتی تو ہرج نہ تھا۔ لیکن یہ وفات کی بات اگر غلط نکلے تو قباحت ہوگی۔ یا تو ایسی باتوں کو لکھو ہی نہیں یا نام لے کر نہ لکھو کنایۃً لکھو۔ اور یا پھر ترکی میں لکھو کہ کوئی سمجھے ہی نہیں۔ اس سب کا مرزا غالب یہ مطلب سمجھے کہ مرزا قتیل وفات کے لئے جامہ گذاشتن کے محاورہ کا استعمال صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ وائے بریں عقل یہ کیسی طرح یقین کر لے کو جی نہیں چاہتا کہ مرزا غالب نے رقعہ پڑھ کر اس کا مطلب نہ سمجھا ہو۔ پھر یا تو انھوں نے دانستہ غلط معنی پہنا کر اعتراض وارد کیا ہے۔ اور یا پھر شاید انھوں نے یہ رقعہ خود دیکھا ہی نہیں۔ محض سنی سنائی باتوں پر یقین کر بیٹھے۔ اور کیونکہ یہ ایک صورت تھی مرزا قتیل کے خلاف نکتہ زنی کی اس لئے بلا تحقیق اس کو لے اڑے بلکہ اس کو وزنی بنانے کے خیال سے یہ بھی کہہ دیا کہ میں نے ترجمہ

---

[۹۱] رقعہ ۱۷، مطبوعہ رقعات قتیل

دیکھا ہے۔ اس کے متعلق اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اگر سماعی بات پر یقین کر کے مرزا کا اعتراض کر بیٹھنا نہایت نامستحسن اور قبیح فعل ہے تو خود پڑھ کر اور اس کو دانستہ غلط معنی پہنا کر اعتراض کرنا قبیح تر ہے۔

مرزا قتیل اودھ دربار میں تھے۔ ہندوستان کے درباروں کی روزمرہ کی سازشیں اور پوشیدہ چالیں ہر وقت ان کے پیش نظر تھیں۔ شخصی حکومت میں افراد کی جو اہمیت ہوتی ہے اس سے وہ ناواقف نہ تھے۔ اسی لئے وہ اپنے دوستوں اور شاگردوں کو اکثر لکھتے رہتے تھے کہ دربار کے معاملات میں دخل دینے یا ان پر رائے زنی کرنے میں بے حد احتیاط سے کام لیں۔ اس کی متعدد مثالیں خود رقعات قتیل میں ہیں۔ رقعہ نمبر ۱۹ میں کہتے ہیں:۔

"سطرے متضمن مذمت ہرکارہ ہائے ڈاک در علائے بد در حق شان بود۔ آئندہ ازان اجتناب ضرورت است۔ گاہ ہست کہ خط بدست کسے بیفتد۔"

رقعہ ۲۷ میں فرماتے ہیں:۔

"وانچہ شما در حق خیرات علی عرضے کردہ بودید کہ بعد وفات نواب آصف الدولہ امیر الدولہ مرحوم خواست کہ الکا ملازم خود سازد قبول نکرد ہنگامِ آن سنجال نرسیدہ باشد۔ ظاہر است کہ امیر الدولہ ہشت سال پیش از آصف الدولہ قضا کردہ بود۔ شاید غرض شما از امیر الدولہ حسن رضا خاں بودہ باشد۔ بدانید کہ امیر الدولہ خطاب حیدر بیگ خاں بود و حسن رضا خاں را سرفراز الدولہ می گفتند۔ ومخالفان بریں قول اعتراض می کنند گویندہ را متہم بکذب می سازند۔ آئندہ

اندکے تحقیق نمودہ حرف باید زد۔ ومقدمات دربار بسیار نازک می باشد اگرچہ شما ہنوز طفل اند احوال امرائے لکھنؤ چہ می دانید وچہ ضرور کہ ایں چیزہا را تحقیق بکنید لیکن در دربار آنچہ معلوم باشد باید گفت"

جس کو نواب سعادت علی خاں کے زمانے کے لکھنؤ کی تاریخ اور ان کے انتظام سلطنت سے تھوڑی بھی واقفیت ہے وہ اس "احتیاط" کی اہمیت فوراً سمجھ لے گا۔ نواب موصوف کی سلطنت کا دار ومدار ہی دار الاخبار پر تھا اور جاسوسوں اور پرچہ نویسوں کی وہ بن آئی تھی کہ بڑے سے بڑا امیر بھی ان کے رحم وکرم پر تھا۔[۱]

(۸) مرزا قتیل نے اردو کا محاورہ فارسی میں باندھا ہے۔ "ہیچ نہ بود" کی جگہ "خاک نہ بود" لکھ گئے اس کے متعلق ہم چاہتے ہیں کہ شروع ہی میں یہ اعتراف کر لیا جائے کہ مرزا غالب کا یہ اعتراض بالکل ٹھیک ہے۔ اور 'خاک نہ بود' بجائے 'ہیچ نہ بود' یقیناً غلط فارسی ہے۔

یوں تو اس اقرار کے بعد اب کسی مزید بحث کی گنجائش نہیں رہتی لیکن حسب ذیل چند معروضات پیش ناظرین کی جاتی ہیں ممکن ہے ان کے مطالعہ کے بعد تعزیر میں نرمی کا امکان ہو سکے۔

پہلے تو شعر ہی کو ملاحظہ فرمائیے ؎

یک وجب جائے بکوئے تو زخون پاک بود ٭ کشتہ بر کشتہ تپاں بود گر خاک نہ بود

---

[۱] تاریخ اودھ از مولوی نجم الغنی صاحب رامپوری۔ جلد چہارم صفحہ ۳۳

"خاک نہ بود" میں ایہام کا پہلو نکلتا ہے۔ کیونکہ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ تیرے کوچے میں بسمل لاشوں کے تودے کے تودے ہیں اور اس قدر ہیں کہ زمین دکھائی نہیں دیتی۔ غالباً یہی ایہام کا لالچ تھا کہ مرزا قتیل غلط محاورہ باندھ گئے[۵] ورنہ مرزا ہیچ اور خاک کا فرق خوب جانتے تھے۔ جیسا کہ انھوں نے نہرالفصاحت صفحہ ۲۷ پہ بیان کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مرزا قتیل عام اہلِ ہند اور اہلِ ایران کی فارسی کے سارے اختلافات کماحقہٗ جانتے تھے۔ نہرالفصاحت صفحہ ۴۶ پر ہر دو طرزِ تحریر کے مفصل نمونے دئے ہیں

---

۵ ایہام کا یہ لالچ اور اس کی اس قدر قدر کچھ مرزا قتیل پر ہی موقوف نہیں۔ وہ زمانہ ہی ایسا تھا بلکہ سچ پوچھئے تو دیوانِ قتیل میں اس قدر کم یہ سستی صنعت پائی جاتی ہے کہ تعجب ہوتا کہ اس ماحول میں رہتے ہوئے مرزا قتیل کیونکر اس ولدل سے اتنے بچے رہے۔ اس عام روش کا اس سے اندازہ لگائیے کہ مرزا قتیل کے دیوان میں کم و بیش سات ہزار اشعار ہیں۔ لیکن اکثر تذکرہ نویسوں نے (جن میں بڑے بڑے صاحبِ ذوق بھی ہیں) قتیل کے اشعار میں سے یہ شعر "خاک نہ بود" والا بالالتزام انتخاب کر کے اپنے تذکرے میں لکھا ہے۔ مثلاً تذکرہ مخزن الغرائب از احمد علی ہاشمی (قلمی) تذکرہ شمع انجمن از نواب صدیق حسن خاں۔ تذکرہ نتائج الافکار از محمد قدرت اللہ (قلمی) وغیرہ وغیرہ

مرزا غالب بھی اس سے بچے ہوئے نہیں تھے۔ بلکہ ان کے اشعار بھی بعض دفعہ اسی لالچ میں بے معنی ہو جاتے تھے۔ مثلاً ؎

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پہ

چار شعر بحث صفحہ ۲۵ پر ہندوستانیوں کی فارسی کے اوپر سیر حاصل بحث کی ہے اور ان کی غلطیاں اور کمزوریاں ظاہر کی ہیں۔ ان سب حوالہ جات کو مفصل بیان کرنا یقیناً تطویل لاطائل کے مترادف ہوگا۔ اہل ذوق ان مقامات کو خود دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن ان کا ذکر محض اس لئے کیا گیا کہ "ہندی فارسی نویس" کی پھبتی کسی طرح مرزا قتیل پر عاید نہیں ہوتی باوجودیکہ ان سے ایک جگہ محاورے کی غلطی ہو گئی ہے۔

اب آئیے یہ بھی دیکھیں کہ کس درجے کی غلطی ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ ہندی محاورے کا ترجمہ اور استعمال فارسی میں جائز نہیں۔ اور گو یہ مخصوص محاورہ ایسا ہے کہ اس میں فارسی لفظ استعمال کیا گیا ہے (خاک) لیکن چونکہ اردو میں اس ترکیب کے معنی فارسی سے جدا لئے جاتے ہیں اسلئے ہندوستانی معنوں میں اس کا استعمال فارسی میں جائز نہیں کیونکہ فارسی میں ان معنوں میں کسی استاد نے نہیں لکھا۔ جیسا عرض کیا جا چکا ہے یہ قاعدہ بالکل درست لیکن شاید اس کی سختی کچھ کم ہو جائے اگر ناظرین یہ یاد فرمائیں کہ یہ بدعت قتیل سے پہلے (اور بعد میں بھی) اکثر ہوتی رہی ہے۔ اور ان لوگوں سے سرزد ہوئی جن کو مرزا غالب جیسا سخت گیر نقاد استادی کا درجہ دے چکا ہے۔ مرزا قتیل نے نہر الفصاحت کے صفحہ ۳ پر ایک بحث شروع کی ہے۔ "باید دانست کہ عوام ہند کہ خبر از فارسی نہ دارند لفظے چند استعمال کنند در مجمع اہل زبان موجب ریشخند باشد" اور اس کے بعد ایسے الفاظ اور ترکیبوں کی ایک مفصل فہرست دی ہے جو تین صفحوں پر بسیط ہے۔ اس کے بعد ایسے الفاظ دئے ہیں جو گو محاورۂ اہل ہند ہیں لیکن ایرانی شعرا نے

استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً روزگار بمعنی نوکری۔ اشرف ماژندرانی کہتا ہے:-

ع بہندز لطف او بے روزگار است

یا آبگینہ بمعنی آئینہ۔ مرزا صاحب نے کہا ہے ؎

گناہ نہ بستنیٔ خود را بآبگینہ منہ ٭ مکن چو سنگدلان شکوہ از زمانۂ خویش

یا بادفروش بمعنی بھاٹ۔ ابونصر بدخشانی نے جو کبھی ہندوستان نہیں آیا باندھا ہے ؎

بسان بادفروشاں چہ بادہ پیمائی ٭ کہ در شعر انسبت خود از گروہ براری

خسرو علیہ الرحمۃ نے ہندی محاورہ "تیری گرہ سے کیا گیا" اس طرح باندھا ہے ؎

ادمی رود بناز دگرہ می زند بہ زلف ٭ مردن مراست از گرہ او چہ می رود

اس کے علاوہ خود مرزا غالب نے ہندی محاورہ فارسی میں استعمال کیا ہے اور میری گرہ سے کیا گیا کو اس طرح ترجمہ فرمایا ہے ؎

گوئی مباد در شکن طرہ خوں شود ٭ دل زاں تست از گرہ ما چہ می رود

"لفظ پیر نورانی بچہ ہائے ہندی نژاد کا تراشا ہوا ہے مرزا جلال اسیر علیہ الرحمۃ مختار ہیں۔ اور ان کا کلام سند ہے۔ میری کیا مجال کہ ان کے باندھے ہوئے لفظ کو غلط کہوں۔ لیکن تعجب ہے اور بہت تعجب ہے کہ امیر زادۂ ایران ایسا لفظ لکھے؎ [1]"

---

[1] جلال اسیر پر مرزا غالب صرف تعجب کر کے رہ گئے اور غلط کہنے کی بھی مجال نہ ہوئی۔ لیکن بے چارے قتیل کو ایسی ہی غلطی پر سب کچھ کہہ ڈالا۔ اس موقعہ پر خود مرزا غالب کا ایک لطیفہ یاد آتا ہے۔ ان کا ایک شعر ہے ؎ (باقی صفحہ ۹۲ پر)

ایسی مثالیں اور بھی بہت دی جاسکتی ہیں۔ لیکن اتنی ہی مثالوں سے یہ تو واضح ہو گیا ہوگا کہ فارسی میں ہندی محاورے کا استعمال نہ اتنی زبردست بدعت ہے کہ کسی اور سے سرزد نہ ہوئی ہو نہ ایسا جرم کہ اس کا مرتکب گردن زدنی ٹھیرے۔

غلطی سے تو غالب بھی بچے ہوئے نہیں ہیں

ان تفصیلات کے بعد ایک چیز جو بالکل صاف ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ مرزا غالب نے غالباً مرزا قتیل کی تصانیف کو دیکھے بغیر ان پر اعتراضات کر دئے۔ اور پھر اس میں حق و صداقت، ادب و قاعدہ تمیز اور تہذیب کا لحاظ تو الگ رہا صریح اور بین غلط بیانیوں اور دروغ بافیوں سے کام لیا اور بے وجہ اور بے دلیل قتیل کو ہدفِ ملامت بنایا۔ ایک کے سوا باقی کے سب اعتراضات بلا کسی اصل کے ہیں۔ اس ایک اعتراض میں بھی مرزا غالب نے سوئی کو بھالا اور رائی کو پہاڑ بنا کر بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ بہر حال اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ واقعی خاک نہ بود، میں قتیل سے ناقابلِ عفو غلطی ہوئی ہے تب بھی یہ ایسی چیز نہیں جس کی وجہ سے کسی کی ساری لیاقت پر پانی پھر جائے۔ غلطی سے کون بچا ہے۔ جیّد سے جیّد عالم اور بڑے سے بڑے شاعر کی غلطیاں ظاہر کی

بود ئے کہ در آن خضر را عصا خفتست ؎ بسینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفتست

اسپر "عصا خفتست" پر اعتراض ہوا تو مرزا غالب نے شیخ سعدی کے مطائبات میں سے ایک مصرع پڑھا ؎ وسیہ بر حملہ اول عصائے شیخ بخفت + اور کہا کہ میں چونکہ ہندی نژاد ہوں تو مجھ پر اعتراض ہوتا ہے۔ چچا سعدی کا عصا کوئی نہیں پکڑتا۔

جا چکی ہیں۔ خود غالب کہاں کے ایسے دودھ کے دھوئے تھے۔ فارسی کو فی الحال چھوڑیئے کہ اس کی اصل جانچ اہل زبان ہی کر سکتا ہے۔ ان کے اُردو کلام میں جس کی وجہ سے مرزا غالب غالب بنے بہت سی غلطیاں پکڑی گئی ہیں۔ میرا مطلب حرف گیری اور نکتہ چینی نہیں۔ بلکہ محض یہ ظاہر کرنا ہے کہ خطا اور سہو سے تو غالب بھی مبرا نہیں۔ ذیل میں غالب کی چند ایک صرف ایسی لغزشیں بیان کی جاتی ہیں جو غالب کے کسی اور معترض کے ہاں میری نظر سے نہیں گذریں:۔

شتر گربہ:۔

شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا ؎ آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

وعدہ آنے کا وفا کیجئے یہ کیا انداز ہے ؎ تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

بوسہ نہیں، نہ دیجئے دشنام ہی سہی ؎ آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

نامکمل فقرہ:۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ؎ ہم کو تقلید تنک ظرفیٔ منصور نہیں

مصرعہ ثانی یوں ہوا: "ہم کو منصور کی تنک ظرفی کی تقلید نہیں"! کیا نہیں؟ کہنا چاہتے تھے کہ تقلید پسند یا منظور نہیں لیکن یہ مصرع میں نہ آسکا۔ یہ مستحسن مقدرات میں سے نہیں گنا جا سکتا۔

نامکمل مضمون:۔ غالب کے دیوان میں ایک چار شعر کی غزل ہے "جگر کو دیکھتے ہیں" "گھر کو دیکھتے ہیں" اور جس کا ایک بے مثل شعر ہے ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے ؎ کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اس غزل کا مطلع ہے ؎

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں ٭ کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

اس مصرعہ اولیٰ میں حرف شرط کا کیا موقعہ ہے۔ یہ شعر کسی اور شعر سے ربط نہیں کھاتا۔ مضمون ادھورا رہ گیا۔

تحریف فی محاورہ:

ہم سے عبث ہے گمان رنجش خاطر ٭ خاک میں عشاق کے غبار نہیں ہے

یہاں یہ مطلب ادا ہے کہ معشوق کو ہم سے ناحق رنجش ہے کیونکہ ہم عاشقوں کے خمیر یا سرشت ہی میں غبار نہیں ہے[ا] لیکن مرزا غالب یہاں خاک کا لفظ غلط استعمال کر گئے۔ اُردو میں ایسی جگہ خمیر یا سرشت کی جگہ مٹی کہتے ہیں نہ کہ خاک۔ زندگی کی حالت میں مٹی اور مرنے کے بعد خاک + کہتے ہیں" بڑی بے وفا مٹی ہے آپ کی۔ کبھی پوچھتے بھی نہیں" یا جس شخص کے بہت پھوڑے پھنسی نکلتے ہیں اس کے لئے کہتے ہیں کہ "بہت کچی مٹی ہے"۔ یا مثلاً کوئی کسی دور دراز سفر پر جائے اور دوست احباب منع کریں اور کہیں کہ وہاں مر نہ جاؤ۔ تو کہا جاتا ہے" جہاں کی مٹی ہے وہیں موت آئے گی اس کا کیا فکر" غرضیکہ زندگی کی حالت میں ان معنوں میں کسی جگہ بھی خاک نہیں بولتے۔ ہاں مرنے کے بعد خاک کہتے ہیں۔ میر محمد علی بیدار کا شعر غالب سے پہلے کا کہا ہوا ہے ؎

ہم خاک بھی ہو گئے ولیکن ٭ جی سے نہ ترے غبار نکلا

[ا] اس کے علاوہ یوں بھی "خاک میں غبار ہونا یا نہ ہونا" بالکل خلاف محاورہ ہے۔ دل میں غبار ہونا کہتے ہیں۔

غالب کا شعر زندگی کی حالت کے متعلق ہے اس لئے مٹی کے بجائے خاک کا استعمال غلط ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ مرزا قتیل کے ہاں فارسی میں اسی خاک کے لفظ پر مرزا غالب نے اعتراض کیا تھا جسے اردو میں خود غلط استعمال کر بیٹھے۔

غلط محاورہ :- اردو کا محاورہ ہے کھلنا بالکسر اول بمعنی بہار دینا جچنا۔ مناسب اور بھلا معلوم دینا۔ جیسے " یہ اچکن آپ پر بہت کھلتی ہے"۔ غالب نے کھلنا بالضم اسی معنی میں باندھا ہے ع صبح دم دروازۂ خاور کھلا' کی زمین میں فرمایا ہے ؎

تاج زریں مہرِ تاباں سے سوا ٭ خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا

واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ ٭ زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

یا ع۔ رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا' کی زمین میں کہا ہے ؎

زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

خلافِ واقعہ یا خلافِ ارادہ باتوں کا اظہار :- ؎

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو ٭ نہ ہوئی غالب اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

اس شعر سے تو یہ نکلتا ہے گویا عمرِ طبعی عشرتِ صحبتِ خوباں سے بہتر چیز ہے۔ لیکن خیر اگر وہ نہیں تو یہی سہی ع گندم اگر بہم نہ رسد بھس غنیمت است۔ حالانکہ ارادتاً تو شاید غالب نے کبھی یہ بات نہ کہنی چاہی ہو۔ "غنیمت سمجھو" کی جگہ اگر "کو حاصل سمجھو" ہوتا تو خاصی بات بن جاتی۔

حشو و زوائد۔ عجز گوئی ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں ٭ رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

اس لب سے مل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو ہاں ؛ شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیئے

یہ "ہاں" اور "کبھی تو ہاں" کی الاپ محض تال پوری کرنے کے لئے نہیں تو اور کیا ہے۔

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں ؛ ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

یہاں "کچھ نہ کیا" "آنہ سکا" "کچھ نہ کی" باندھ دیا۔

غیر فصیح الفاظ کا استعمال ، الفاظ کی مناسبت شاعری کی جان ہے۔ ایک جگہ ایک ہی قسم کے الفاظ سے جو توازن اور تناسب کلام میں پیدا ہو جاتا ہے وہی اصل فصاحت ہے۔ اس کی مثال میں شبنم کے متعلق یہ دو مصرعے اکثر پیش کئے جاتے ہیں :-

ع کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا

ع شبنم نے بھر دئے تھے کٹورے گلاب کے

پہلے مصرعے میں ہندی لفظوں کی سنگت ہے۔ دوسرے میں شبنم اور گلاب کا اتصال ۔ اگر اس مصرعے میں شبنم اور اس میں اوس ہو تو فصاحت کا خون ہو جائے۔ اب غالب کے دو ایک شعر سنئے ؎

توسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب ؛ تھان سے یہ غیرتِ صرصر کھلا

توسن شہ ، غیرتِ صرصر اور .... تھان !

پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ

پہلے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ ڈالی ہے ! اور بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل ٹھونکی ہے !!

بھول پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے
مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے

بھول پا اور بھول تو میں تھوڑا ہی فرق ہے۔

الفاظ سوقیانہ کا استعمال سے

چھوڑی اسد نہ ہم نے گدائی میں دل لگی ٭ سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

ع غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے

دھکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا ٭ عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا
دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں ٭ ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایکدن
غم زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی ٭ وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

معنی میں ابتذال: سے

مزا ملے کہو کیا خاک ساتھ سونے کا ٭ رکھے جو بیچ میں وہ شوخ سیمتن تکیہ
کافی ہے نشانی ترے چھلے کا نہ دینا ٭ خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت
بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ ٭ جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

کم درجے کی اور سستی مراعات النظیر۔ ایہام۔ رعایت الفاظ جس سے اکثر شعر بے معنی ہو گیا سے

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے ٭ کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے
یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں ٭ زلف گر بنجاؤں تو شانے میں الجھائے مجھے
منہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا پر بانداز عتاب ٭ کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے
لکھتا ہوں اسد سوزشِ دل سے سخن گرم ٭ تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت
خط عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد ٭ یک قلم منظور ہے جو کچھ کہ ارزانی کرے

کہاں تک روؤں اس کے خیمہ کے پیچھے قیامت ہے ؎ مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی
در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا ؎ جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا
اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر ؎ مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا
نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی ؎ سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پہ
کیوں ہوتے ہیں باغباں تونبے ؎ گر باغ گدائے مے نہیں ہے
مگر لکھوائے کوئی اسکو خط تو ہم سے لکھوائے ؎ ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے یہ چند اشعار ایسے یہاں درج کیے گئے ہیں جو کسی اور معترض کے ہاں میں نے نہیں دیکھے۔ ان کے علاوہ ان کے بے شمار ایسے اشعار ہیں جو نہ اردو کے ہیں نہ فارسی کے اور گو توجیہ اور تاویل کرنے کو کر لی جائے لیکن اکثر ان میں سے بالکل بے معنی ہیں۱؎ ایسے ہی

۱؎ فرید آباد میں ایک دفعہ ایک مشاعرہ ہوا۔ طرح تھی 'جائے تو اچھا' 'لائے تو اچھا' ایک بزرگ ماسٹر رتی رام صاحب نے بھی غزل پڑھی۔ عجیب عجیب شعر نکالے تھے مثلاً ان میں سے ایک یہ تھا؎

دل بند حنا بند گھڑی ہاتھ مل رہی ؎ یہ دست و پائے خویش اسی مل جائے تو اچھا

حسن اتفاق سے قائم داستان گویان ہند۔ یکتائے زمانہ میر باقر علی داستان گو دہلوی شریک مجلس تھے۔ انھوں نے اس قدر برجستہ اور عمدہ معنی اس شعر کے بتائے کہ محفل حیران رہ گئی۔ یہ اور بات ہے کہ پھر تخلیہ میں میر صاحب مرحوم اور ہم گھنٹوں ماسٹر صاحب کی لاجواب غزل پر "سر دھنتے" رہے خصوصاً جب میر صاحب مرحوم نے اپنے مخصوص انداز میں "بھائی رتی کا منہ کالا" کہہ کر محفل برخاست کرنی چاہی۔

سینکڑوں جگہ انھوں نے فارسی محاورے کو ترجمہ کر کے اُردو میں استعمال کیا ہے، گو اُردو میں اس کے معنی بالکل جدا ہیں مثلاً دیکھنے کے لئے تماشا کرنا یا ہونے کے بجائے آنا مثلاً سے

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا ؎ دل جگر تشنۂ فریاد آیا

ایسے اور دیگر قواعد و معانی کے نقطۂ نظر سے غالب پر مولانا نظم طباطبائی، یاس یگانہ، آرگس اور دیگر اصحاب نے بہت سے اعتراضات کئے ہیں۔ "تذکرۂ معرکۂ سخن از مولانا عبدالباری آسی میں بھی پچیس تیس صفحوں میں غالب پر کئے ہوئے اعتراضات جمع کر کے درج کئے گئے ہیں۔

ان کے علاوہ بھی مرزا کی کئی ایک غلطیاں ایسی تھیں جو ان کی زندگی ہی میں ان کو بتلا دی گئی تھیں اور جن کی انھوں نے اصلاح کر لی تھی[۹۱] قاطع برہان تردیدی بیان تھا۔ یہ اور اس سلسلے کی دوسری کتابیں دوسروں کی لکھی ہوئی لغت کی غلطیاں نکالنے کے لئے لکھی گئی تھیں خود غالب کو بھی اعتراف ہے کہ یہ بہت احتیاط اور کاوش سے لکھی گئی تھیں[۹۲] لیکن اس تمام کوشش کے باوجود بھی وہ آویزہ اور افسوس کے بارے میں دھوکا کھا گئے[۹۳] اور انہی فارسی نویسانِ ہند کی نکتہ چینی پر اس کی اصلاح کی۔ اس سے ان کو اندازہ ہونا چاہیئے تھا کہ فرہنگ لکھنا کتنا مشکل کام ہے۔ اور اس میں غلطیاں رہ جاتی

---

[۹۱] یادگار غالب صفحہ ۷۵، غالب از مہر صفحہ ۲۷۰ تا ۲۷۲

[۹۲] ادبی خطوطِ غالب صفحہ ۱۹۷

[۹۳] " " " ۱۱۶

کتنا آسان ہے۔ دستنبو بڑے دعووں اور تیاریوں کے ساتھ لکھی کہ فارسی کے علاوہ اور کوئی لغت نہ آئے گا۔ پھر بھی عربی کا ایک لفظ استعمال کر گئے اور اس کو بعد میں نکلوایا۔ بعض جگہ بتائے پر بھی نہ مانے۔ مثلاً فرازکہ اگرچہ دراصل لغتِ اضداد میں سے ہے لیکن وہ اس پر اڑے رہے کہ اس کے معنی صرف "بند" کے ہیں[91]۔ یا مثلاً ان کے ایک مطلع سے

از جسم بجاں نقاب تا کے ؛ ایں گنج دریں خراب تا کے

پر ایک عالم خراسانی عارف علی شاہ خراسانی نے تین اعتراض کئے" پہلا نقاب کے ساتھ عارض و رخ کا ذکر بھی ضرور تھا وہ نہیں۔ دوسرا گنج تو ویرانے ہی میں ہوتا ہے پھر اس پر تاسف کیا جو کہتے ہو "تا کے"۔ تیسرا ویرانہ کو خرابہ کہتے ہیں نہ خراب۔ اور ان اعتراضوں کے بعد انھوں نے ذیل کیا تھا

از جسم بجاں حجاب تا کے ؛ گل بر رخ آفتاب تا کے[92]

یہ اعتراض اور اصلاح غالب نے نہ مانی۔ خراب بمعنی خرابہ کے لئے صائب کا ایک شعر سند میں پیش کیا۔ لیکن یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ اعتراض بھی ایک اہلِ زبان نے کیا تھا اس لئے صرف ایک سند سے کام نہیں چل سکتا۔ خواہ وہ اہلِ زبان کی ہی کیوں نہ ہو۔ پھر مرزا صائب کے متعلق تو خود غالب کا قول ہے کہ وہ غلط بندشیں بھی باندھ جاتے تھے۔ فرماتے ہیں:۔ "صائب اگرچہ اصفہانی نژاد تھا لیکن وارد شاہجہان آباد تھا۔

---

۹۱ ادبی خطوط غالب صفحہ ۲۰۲

۹۲ " " " " ۱۰۲

انتظام کشیدن اور انتقام گرفتن دونوں بول گیا[۹۱]۔ حجاب اور نقاب اور گنج دو ویرانہ میں بھی مرزا غالب نے بہت سی تاویلیں کی لیکن کوئی سند نہیں دی۔

اسی طرح اُردو میں اُردو کو مذکر لکھا ہے[۹۲]۔ غور کو مونث[۹۳] چابی کو انگریزی لغت بتایا ہے[۹۴]۔ بہر حال مطلب یہ ہے کہ غلطیاں سب سے ہو ہی جاتی ہیں۔ غالب کے ہاں بھی ان کی کمی نہیں۔ کچھ ان کی زندگی میں دوسروں کے بتانے سے درست کر لی گئیں۔ کچھ اب بھی موجود ہیں۔ لیکن ان کی وجہ سے غالب کے کمال شاعری پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اسی طرح قتیل کی صرف ایک غلطی کو ناقابل عفو نہیں کہا جا سکتا۔ کیا عجب ہے کہ اگر وہ نظرِ ثانی کرتے تو خود اس کو درست کر لیتے۔ مرزا قتیل کسی مسودہ پر نظرِ ثانی نہیں کیا کرتے تھے۔ وہ اس محنت کو ناقابلِ برداشت سمجھتے تھے[۹۵]۔

اس قضیہ کی اصل اصل میں یہ معاملہ صرف چند اعتراضات اور جوابات کا نہیں ہے اس سارے جھگڑے کی جڑ یہ ہے کہ مرزا غالب کے نزدیک خود ان کے اور امیر خسروؒ کے علاوہ اور کوئی ہندوستانی صحیح فارسی جاننے کا

---

۹۱ ادبی خطوط غالب صفحہ ۸۶

۹۲ " " " " ۴

۹۳ " " " " ۱۳۴

۹۴ " " " " ۲۰۹

۹۵ رقعاتِ قتیل " ۳۲

اہل ہی نہیں۔ گو خود ہندی نژاد تھے۔ نہ کسی عجمی سے صحبت ہی رہی تھی[۹۱] اور نہ اس زمانے میں ہندوستان میں فارسی کا کچھ زیادہ چرچا ہی رہ گیا تھا۔ انیسویں صدی کے ربع اول تک سرکاری زبان ہی فارسی نہ تھی[۹۲] بلکہ شرفا کے گھر کی زبان بھی فارسی تھی۔ پھر چونکہ ہندوستانی سیاست بھی ابھی بالکل مردہ نہیں ہو گئی تھی اس لئے ایرانی شعراء اور اہل علم کا بھی تانتا لگا رہتا تھا۔ وفا قمی۔ متین۔ ہاتف۔ موالی۔ گرامی۔ نزوغ۔ فدائی۔ حشمت والہ داغستانی۔ علی حزیں وغیرہ وغیرہ اٹھارویں صدی کے ختم کے قریب تک ہی ہندوستان میں آ گئے۔ درباروں کے علاوہ بھی اس قدر ایرانی تلاش معاش آئے تھے کہ عام طور پر فارسی انہی لوگوں سے پڑھی جاتی تھی ایران اور ہندوستان میں رشتہ داری اور شادی بیاہ کے تعلقات بھی قائم تھے۔ لیکن غالب کے زمانے میں یہ سب بدل چکا تھا۔ اور ذوق اور ظفر کی وجہ سے ادبی حلقے سے بھی فارسی نکالی جا چکی تھی۔ گویا ہندوستان میں رہ کر فارسی کو کما حقہٗ حاصل کرنے کے بہت کم مواقع رہ گئے تھے۔ لیکن مرزا غالب کہتے تھے کہ ان کا فارسی ذوق اور علم زباں دانی الہامی اور وجدانی ہے۔ اور براہ راست مبدا فیض سے عطا ہوا ہے۔" اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر[۹۳]" ایک اور جگہ فرمایا ہے کہ" زبان دانی فارسی

---

۹۱ ہرمز کی شاگردی سے بھی انکاری تھے۔ یادگار غالب صفحہ ۱۱

۹۲ ۱۸۳۵ء تک سرکاری زبان فارسی تھی لیکن اصلیت میں فارسی اٹھارویں صدی کے ساتھ ہی ختم ہو چکی تھی۔

۹۳ ادبی خطوط غالب صفحہ ۱۵۲

میرا ازلی دستگاہ ہے اور یہ عطیہ خاص من جانب اللہ ہے[۵۱]" اور سب کی فارسی کیونکہ اکتسابی تھی اس لئے ناقص۔ یہ ہیں اصل میں ان کے اعتقادات اور دعادی۔ باقی ہندوستانی فارسی دانوں پر طعن و تشنیع اور سب و شتم تو گویا انہی مفروضات کا لازمی شاخسانہ تھا۔ اب آئیے ان کی اس منطق اور ان دونوں دعوؤں کا بھی تجزیہ کرلیں۔

کیا مرزا غالب کا علم فارسی الہامی تھا

ایک صورت تو اس دعوے کے جانچنے کی یہ ہے کہ مرزا غالب کی تعلیم و تعلم کا ذکر کیا جائے جس نے مرزا غالب کو فارسی سکھائی۔ ملا عبدالصمد ہرمز کو اگر نظر انداز بھی کردیا جائے تو بھی مولوی معظم کی شاگردی سے تو انکار نہیں۔ اس کے علاوہ دلی میں آنے کے بعد انھوں نے فارسی شعرا کا غائر مطالعہ کیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ مرزا کے کلام کی روایات کا سلسلہ جو بیدل ظہوری عرفی نظیری کے واسطے سے امیر خسرو تک پہنچتا تھا۔ اور ان کے کلام میں انہی شعرا کی خصوصیات آگئیں[۵۲]" دلی میں خوش قسمتی سے ان کو ایسے باکمال لوگوں کی صحبت میسر آئی کہ طبیعت میں اور جلا پیدا ہوگئی۔ فنکار کے کلام سے فیض یاب ہوسکے اور انہی کے طفیل کچھ حاصل کرسکنے سے سنجیدہ لمحوں میں ان کو خود بھی انکار نہ تھا۔

دامن از کف ننم چگونہ رہا ؟ طالب و عرفی و نظیری را

خاصہ روح روانِ معنی را ؟ آن ظہوری جہان معنی را

---

۵۱ ادبی خطوط غالب صفحہ ۱۱۴

۵۲ غالب نامہ " ۲۹

اس کے علاوہ نثر میں بھی اپنے خطوط میں متعدد بار اساتذۂ سلف کے کلام سے اکتسابِ فیض کا اقرار کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"غالب کہتا ہے کہ اساتذہ کے کلام کے مشاہدے میں اگر تو غل رہے تو ہزار ہا بات نئی معلوم ہوتی ہے[۵۱]"

پھر فرمایا :-

"جب رودکی و عنصری و خاقانی و رشید وطواط اور ان کے امثال و نظائر کا کلام بالاستیعاب دیکھا جائے اور ان ترکیبوں سے آشنائی بہم پہنچائی جائے اور ذہن اعوجاج کی طرف نہ لے جائے تب آدمی جانتا ہے کہ ہاں فارسی یہ ہے[۵۲]"

غرضکہ یہ بات کچھ معرضِ شبہ میں نہیں کہ غالب کی فارسی دانی کی بنیاد کیا تھی۔ لیکن اتمامِ حجت کے خیال سے آیئے ان کے اس دعوے کو ایک زاویۂ نگاہ سے بھی دیکھ لیا جائے :-

علم زبان دانی کے الہامی اور وجدانی ہونے کی ایک ہی دلیل ہو سکتی ہے کہ مدعی کا ہر ایک قیاس اور اجتہاد صحیح نکلے اور بغیر نظائر و امثال کی طرف رجوع ہوئے وہ صحیح فیصلہ کر سکے۔ اور پھر اس کے بعد کسی دلیل۔ سند۔ نظیر کی ضرورت نہ رہے۔ جو دلائل و نظائر دستیاب ہوں وہ اس کی موافقت ہی میں ملیں اور جو دو ایک اس کے خلاف ہوں وہ غلط ٹھہریں۔ اس کسوٹی پر اگر

---

۵۱ ادبی خطوط غالب صفحہ ۹۸

۵۲ " " " " ۵۹

کہا جائے تو مرزا کا الہام اکثر باطل ثابت ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں کئی مقام ایسے ملتے ہیں جہاں انھوں نے کچھ اور لکھا تھا لیکن بعد میں کسی استاد کی اصلاح یا دوست کی صلاح کے بعد ترمیم کر لی۔ اس کے علاوہ ایک جگہ فرماتے ہیں :۔

"لفظ (رحم و چم) پیارا۔ مجھے بھی پسند۔ مگر کیا کروں جو اپنے پیشواؤں سے نہ سنا ہو اس کو کیونکر صحیح جانوں[۹۱]"

ایک اور جگہ فرمایا ہے :۔

"میں کسی کلمے کا استعمال نہیں کرتا جب تک اہل زبان کے کلام میں نہیں دیکھ لیتا[۹۲]"

ایک جگہ اور لکھا ہے :۔

"فقیر نے اساتذہ کے کلام میں کہیں یہ ترکیب نہیں دیکھی پس میں اس کی صحت اور غلطی میں کلام نہیں کر سکتا[۹۳]" گویا مبدا فیض کا دروازہ بند ہے اور کلام اساتذہ سے مدد مانگی جا رہی ہے۔ مختصر یہ کہ یہ چیز صاف ظاہر ہے کہ مرزا غالب کی فارسی دانی کی بنیاد بھی وہی قدماء کا کلام اور تحریرات تھیں جن سے اور سب نے بھی کسب فیض کیا ہے۔ ہاں اس میں مراتب ہیں۔ غالب نے اس میں بہت جگر کاوی کی تھی اور اسی مناسبت سے انھیں اس پر عبور بھی حاصل تھا۔

---

۹۱ ادبی خطوط غالب صفحہ ۱۷۲

۹۲ " " " " ۷۰

۹۳ " " " " ۱۰۱

کیا اور ہندوستانیوں کو صحیح فارسی آ ہی نہیں سکتی

تنقیح نمبر ۱ میں یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ مرزا غالب کا علم فارسی بھی اسی طرح اکتسابی تھا جیسا کہ کسی اور کا ہو سکتا ہے۔ پھر جب وہ ہندی نژاد ہمیشہ کے ہندوستان میں رہنے والے اور ایسے زمانے میں رہنے والے جبکہ فارسی ذوق کا مرثیہ پڑھا جا چکا تھا فارسی زبان دانی کے ماہر ہو سکتے ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان کے وسیع ملک میں اللہ کی یہ رحمت کسی اور پر نازل نہیں ہو سکتی۔ اگر واقعی الہام اور وجدان بھی ہوتا تو بھی اس سوت کا سوکھ جانا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ خود غالب کہتے ہیں ؎

ہر خوشے را خوشترے ہم بودہ است ؎ گر سرے ہست افسرے ہم بودہ است

مبداء فیاض را مشمر بخیل ؎ نوز می ریزد رطب ہا زان نخیل[۵۱]

ہاں یہ ممکن ہے کہ یہ دلیل اس وقت کے لئے ہنوز بھی جب ابوالفضل کے مقابلے میں اپنی انشاء کو بہتر ثابت کرنا تھا۔ اپنے مقابلے میں دوسروں کے لئے شاید اس دلیل کو ناقص سمجھتے تھے۔

اس کے علاوہ اس مسئلہ پر اہل الرائے حضرات کا فیصلہ سنئے:۔

صاحب غالب نامہ تو صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ "حقیقتاً یہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے جس پر آج بھی اہل الرائے متفق نہیں[۵۲]" لیکن حالی مرحوم نے اس مسئلہ پر واضح طور پر روشنی ڈالی ہے۔ یادگار غالب صفحہ ۲۱۷ پر فرماتے ہیں:۔

---

۵۱ تقریظ آئین اکبری۔ جو سر سید نے شامل کتاب نہیں کی۔

۵۲ غالب نامہ صفحہ ۹۴

"یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک زباں داں آدمی شاعری میں اہلِ زبان کے برابر ہو بھی سکتا ہے یا نہیں۔ سو شاعری کا ہنر دو مختلف لیاقتوں سے مرکب ہے۔ ایک اسے جی نے شن یعنی قوتِ متخیلہ کی بلند پروازی دوسرے مناسب الفاظ کے استعمال پر قدرت۔ ان میں سے پہلی لیاقت جیسا کہ ظاہر ہے ممکن ہے ایک زباں داں بہ نسبت اہلِ زبان کے۔ ایک کم علم بہ نسبت فاضل متبحر کے اور ایک دیہاتی گنوار بہ نسبت خواص اہلِ شہر کے بمراتب افضل و اعلیٰ درجے کی رکھتا ہو۔ دوسری لیاقت اگرچہ اہلِ زبان کے ساتھ مخصوص معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں بھی مثلاً ایک ہندی نژاد اکتساب کے ذریعہ سے خاصکر اس حصہ زبان میں جو فارسی کی محدود شاعری میں مستعمل ہے اہلِ ایران کی برابری کر سکتا ہے۔ علامہ ابنِ خلدون عربی زبان کے نسبت جو بمقابلہ فارسی کے نہایت وسیع زبان ہے لکھتے ہیں "ایک عجمی (یعنی غیر عربی) فصحائے عرب کی ممارست سے اہلِ زبان میں شمار ہو سکتا ہے۔"

سید انشاء اللہ خاں انشار دریائے لطافت میں فرماتے ہیں:۔

"اس بحث سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ یہ بیانات اس امر کے مانع ہیں کہ جو شخص دوسری جگہ پیدا ہوا ہو ممکن ہے کہ لہجہ اور زبان اُردو جیساکہ چاہیئے سیکھ جائے اور اس کا تصرف لوگوں میں مقبول ہو۔ اور اس کے کلام کو مستند سمجھا جائے۔ کیوں کہ ذکی آدمی کا ہونا ہر جگہ ممکن ہے، اور ہر فنِ شریف کا حاصل ہونا یقینی امر ہے۔ ہاں شرط یہ ہے کہ اس میں پورے طور پر دل لگایا جائے۔ یہ بدیہی بات ہے کہ ایران سے اتنی دور رہ کر

کتابوں اور اہلِ زبان سے سیکھنے سے بڑے پایہ کے فارسی میں کہنے والے شاعر ہندوستان میں ہو چکے ہیں[۵۹]"

گویا یہ دعویٰ بھی غلط ٹھہرا کہ ہندوستانیوں کو صحیح فارسی آ ہی نہیں سکتی

غالب نے زباندانی اور معانی آفرینی کے بیان میں خلط بحث کردیا

یہ بات اور بطور جملہ معترضہ بیان کر دی جائے کہ مرزا غالب نے شاعری کی ان دو مختلف لیاقتوں کے بیان میں اکثر خلط بحث کیا ہے۔ یا شاید وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ہندی نہ صرف زباں دانی میں ایرانیوں سے کم ہیں بلکہ معانی آفرینی میں بھی مقابلتاً ہیچ در ہیچ ہیں۔ فرماتے ہیں :-

"غالب کہتا ہے کہ ہندوستان کے سخنوروں میں حضرت امیر خسرو دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے سوا کوئی استادِ مسلم الثبوت نہیں ہوا .... خیر فیضی بھی نغز گوئی میں مشہور ہے کلام اس کا پسندیدہ جمہور ہے۔ دیکھو عبد القادر بدایونی لکھتا ہے 'زہے سیاہی فالیہ'۔ آرزو فقیر رشید اور بہار وغیرہم انہی میں آ گئے۔ ناصر علی، بیدل اور غنیمت ان کی فارسی کیا۔ ہر ایک کا کلام بہ نظر انصاف دیکھئے ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ منت، املین واقف اور قتیل یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجئے۔ ان حضرات میں عالم علوم عربیہ کے شخص ہیں۔ خیر ہوں۔ فاضل کہلائیں۔ کلام میں ان کے مزا کہاں۔ ایرانیوں کی سی ادا کہاں ...... مولوی احسان اللہ ممتاز کو صنائع لفظی میں دستگاہ اچھی تھی۔ اس شیوہ وروش کو خوب برت گئے۔ فارسی وہ کیا جانیں۔ قاضی محمد صادق اختر عالم ہوں گے۔

---

۵۹ دریائے لطافت صفحہ ۵۱، ۵۲

شاعری سے ان کو کیا علاقہ[۹۱]"

پھر اسی قوتِ متخیلہ کی بلند پروازی کے متعلق فرمایا:-

"یہ چیز نہ حصے میں سب پارسیوں کے آئی ہے۔ ہاں اُردو زبان میں بعض اہلِ ہند نے بھی وہ چیز پائی ہے[۹۲]"

یہ خوب منطق ہے کہ اہلِ ہند اُردو میں تو اس کے اہل ہیں اور فارسی میں نہیں۔ اصل میں یہاں مرزا معمول اور ضرورت سے زیادہ ایرانیت میں رنگے ہوئے ہیں۔ ورنہ وہ سنجیدہ لمحوں میں یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ "ہند کے شاعروں میں اچھے اچھے خوش گو اور معنی یاب ہیں۔ لیکن یہ کون احمق کہے گا کہ یہ لوگ دعویٰ زبان دانی کے باب ہیں[۹۳]۔"

غالب کا بتایا ہوا معیار

بہرحال مرزا غالب نے "ہیچ ما دیگرے نیست" اور "زمانہ مجمع جہال است" کا فلسفہ بیان کرنے کے بعد فارسی کے کھرے کھوٹے پن کو پرکھنے کے لئے ایک معیار بھی بتا دیا۔ فرماتے ہیں:-

"میں اہلِ زبان کا پیرو اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں[۹۴]۔ جب تک قدماء یا متاخرین میں مثل صائب و کلیم و اسیر و حزین

---

۹۱ ادبی خطوطِ غالب صفحہ ۸۴، ۸۵

۹۲ " " " ۸۸

۹۳ " " " ۱۱۵

۹۴ یہ بھی بڑی عنایت ہے۔ ورنہ ہندوستان جنت نشان میں تو ایسے جید عالم کی بھی کمی نہیں جو خسرو کے بھی منکر ہیں۔ حضرت جوش ملیح آبادی نے "یزدان اشکار" (رباعی فلاپیم)

کے کلام میں کوئی لفظ یا ترکیب نہیں دیکھ لیتا اس کو نظم اور نثر میں نہیں لکھتا ہے[۱]"

اسی چیز کو دوسری طرح کہتے ہیں :-

"فقیر نے اساتذہ کے کلام میں کہیں یہ ترکیب نہیں دیکھی ہیں میں اس کی صحت اور غلطی میں کلام نہیں کر سکتا۔ جانب غلطی میرے نزدیک راجح ہے۔ آپ جب تک کلام اہلِ زبان میں نہ دیکھ لیں اس کو جائز نہ مانیئے گا۔ مگر کلام سعدی و نظامی و حزیں اور ان کے امثال و نظائر کا معتمد علیہ ہے نہ آرزو اور واقف اور قتیل و غیرہم کا[۲]"

ایک جگہ فرمایا ہے :-

"غالب کہتا ہے کہ شعرائے ایران کلہم اجمعین مسلم الثبوت ہیں اور ان کا

(بقیہ صفحہ ۱۰۹) کی ترکیب استعمال کی۔ حضرت نیاز فتحپوری مدیر نگار نے اس کو غلط ٹھیرایا۔ اور سند مانگی۔ سند میں امیر خسرو کا یہ شعر پیش کیا گیا ؎

بہر بازی از نرگس پر خمار ، خدنگ افگنان و فرشتہ شکار (آئینہ سکندری)

نیاز صاحب نے اس سند کو ماننے سے صاف انکار کر دیا کہ یہ ہندی نژاد شاعر کی ہے ایرانی الاصل شاعر کی سند کے علاوہ کوئی سند در خورِ اعتنا نہیں۔ اس پر سب سے پہلے مولوی ابوالکمال صاحب آمید امیٹھوی نے صائب کا یہ شعر پیش کیا ؎

بال پرواز ترا ہر چند صائب بستہ اند ، شکر للہ خاطر معنی شکارم دادہ اند

اور پھر حضرت عندلیب شادانی نے بھی قاآنی، سپہر کاشانی، شیبانی، صباحی، کاشفی اور ہاتفی کے اشعار بھی سند آپیش کئے جب نیاز صاحب مانے۔ اس معرکے کے لئے دیکھئے نگار ماہ مئی و جون ۱۹۳۶ء

[۱] ادبی خطوط غالب صفحہ ۷۲ [۲] ادبی خطوط غالب صفحہ ۱۸۵

کلام سند ہے۔ سخنوران ہند میں امیر خسرو دہلوی بھی ایسے ہی ہیں جیسے اہلِ ایران[91]"

گویا انھوں نے کل ایرانی شعرا کو سند مانا ہے۔ چند کو خصوصیت سے نام بنام بھی گنوا دیا ہے۔ جن میں بعض کا ذکر تو حسب بالا اقتباسات میں آیا۔ ان کے علاوہ حسب ذیل کا بھی خصوصیت سے ذکر کیا ہے:۔

"میرا خداوند نعمت نظامی علیہ الرحمۃ فرماتا ہے[92]۔۔۔"

"قالبِ معنی کی جان ہے ظہوری۔ ناطقہ کی سرفرازی کا نشان ہے ظہوری[93]" وغیرہ وغیرہ

ہمیں فی الحال اس سے بحث نہیں کہ مرزا غالب کا بنایا ہوا یہ معیار ٹھیک بھی ہے یا نہیں۔ اس کو اس وقت صحیح مان کر بھی دیکھنا یہ ہے کہ اس معیار کے مرزا غالب خود ہی کہاں تک قائل تھے۔

ادبی خطوطِ غالب کے پہلے ہی خط میں مرزا غالب فرماتے ہیں:۔

"طبع موزوں رکھتا ہوں اور فارسی زبان سے لگاؤ رکھتا ہوں اور یہ بھی یاد رہے کہ فارسی کی ترکیب الفاظ اور فارسی اشعار کے معنی کی پرواز میں میرا قول اکثر خلافِ جمہور پائیگا۔ اور حق بجانب میرے ہوگا۔"

اسی طرح بیش بیشتر کی بحث میں[94] مرزا کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ مرزا قتیل نے

---

[91] ادبی خطوطِ غالب صفحہ ۱۸۵

[92] " " " " ۷۳

[93] " " " " ۸۴

[94] اس بحث کی تفصیل خطوط سے نہیں معلوم ہوتی۔

متعدد اساتذہ مسلم الثبوت کی اسناد سے دوسری بات ثابت کی۔ مرزا حسب عادت نہیں مانتے۔ فرماتے ہیں :-

" صاحب دیکھو پھر تم دنگا کرتے ہو۔ دہی بیش و بیشتر کا قصہ نکالا۔ غلطی میں جمہور کی پیروی کیا فرض ہے[۹۱] "

مرزا تفتہ نے ریمیا اور سیمیا کے متعلق دریافت کیا اور اساتذہ سلف کے اشعار لکھے کہ انھوں نے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ مرزا غالب نے جواب دیا :-

" بھائی ریمیا اور سیمیا خرافات ہے .... یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں وہ حق ہے۔ کیا آگے آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے[۹۲] "

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :-

" بڑی قباحت یہ ہے کہ اعَم تشدید لفظ عربی ہے۔ ع دیگر نتواں گفت اخص را کہ اعم است۔ مگر جبر اور ہو جاتی ہے۔ مانا کہ فارسی نویسان عجم نے یوں بھی لکھا ہو[۹۳] " یعنی پھر بھی منظور نہیں۔

لے لیجئے کہاں تو یہ زور تھا کہ اہلِ زبان میں سے کوئی بھی کچھ کہے وہ سند ہے یا جمہور کی بھی نہیں مانتے۔ حالانکہ جمہور کا کہا ہوا غلط ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر وہ قواعد کے خلاف بھی ہوگا تو مستثنیٰ سمجھا جائیگا ورنہ پھر امثال و نظائر بیکار۔

---

۹۱ ادبی خطوط غالب صفحہ ۱۶۷

۹۲ " " " " ۱۵۸

۹۳ " " " " ۱۶۰

چیز ثابت ہوتی ہے۔

اس عام فیصلہ کے علاوہ بھی انھوں نے تقریباً ہر اس شخص کی جس کو استاد بنایا ہے تحقیر و تحسین کی ہے۔ یا اس کے خلاف اپنے قول کی فضلیت ظاہر کی ہے۔ اور ہندیوں کی جن کی سند کو قبول کرنے سے قطعی انکار کیا ہے بعض جگہ ان کی سند مان لی ہے۔ بایں صورت کہ وہ ان کے قول کے موافق ہو۔ سُنیئے :-

مرزا ہرگوپال تفتہ نے نظر شگفتن اور گوش شگفتن لکھا۔ غالب نے اعتراض کیا ہوگا۔ تفتہ نے ظہوری کی سند دی۔ اس پر فرماتے ہیں :-

" نظر شگفتن اور گوش شگفتن ہم نہیں جانتے۔ اگر چہ منشی ہرگوپال تفتہ اور مولانا نورالدین ظہوری نے لکھا ہو[۵۱]"

علی حزیں کا ایک مطلع ہے سہ

زرکتاریٔ آن نازنین سوار ہنوز ٭ ز سبزہ می دمد انگشت زینہار ہنوز

اسی مطلع پر غالب فرماتے ہیں :-

" حزیں کے اس مطلع میں واقعی ایک ہنوز زائد اور بیہودہ ہے۔ قبح کے واسطے سنا نہیں ہو سکتا۔ یہ غلط محض ہے۔ یہ سقم ہے۔ یہ عیب ہے۔ اس کی کون پیروی کرے گا۔ حزیں تو آدمی تھا یہ مطلع اگر جبرئیل کا ہوتا تو اس کو سند نہ جانو۔ اور اس کی پیروی نہ کرو[۵۲]"

---

۵۱ ادبی خطوط غالب صفحہ ۱۴۴

۵۲ " " " " ۱۴۵

مرزا صائب کے متعلق فرماتے ہیں :-

" صائب اگرچہ اصفہانی نژاد تھا مگر وارد شاہجہاں آباد تھا۔ انتقام کشیدن اور انتقام گرفتن دونوں بول گیا[۹۱]"

حالانکہ مرزا صائب بھی ان خوش قسمتوں میں سے تھے جن کو مرزا غالب نے اساتذۂ مسلم الثبوت میں سے گنوایا تھا۔ شاہجہاں آباد آنے کی ایک ہی ہوئی۔ اس طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ تو پھر اور بہت سے ایرانی شاعر مثلاً عرفی۔ سعدی۔ ظہوری وغیرہ بھی بھشٹ ہو چکے ہیں۔

نظامی کے متعلق مرزا غالب کی رائے کو ہم غالب نامہ میں سے درج کرتے ہیں :-

" ساقی نامے میں انھوں (غالب) نے بے چارے نظامی کا مذاق اڑایا ہے .... لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا ساقی نامہ بہت پھیکا ہے[۹۲]"

خاقانی کے متعلق فرماتے ہیں :-

" اس نے (خاقانی نے) جناب امیرالمومنین کے واسطے ایک لفظ سہل سرسری لکھا میں نے قبول نہ کیا اور اس کے قول کا تنزل ظاہر کر دیا[۹۳]"

فیضی کے لئے ارشاد ہے :-

---

۹۱ ادبی خطوط غالب نامہ صفحہ ۸۶

۹۲ غالب نامہ صفحہ ۷۰

۹۳ ادبی خطوط غالب صفحہ ۱۲۷

"میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے[۵۱]"
جمع الجمع "آمال" کی مثال مرزا تفتہ نے کسی مسلم الثبوت استاد
کے کلام سے دی اس پر لکھا ہے:-
"یہ کھلی سورٹھ ہے۔ ع۔ خطائے بزرگاں گرفتن خطا ست ہم کو
اپنی تہذیب سے کام ہے۔ اغلاط میں سند کیوں ڈھونڈتے پھریں مثلاً
حضرت حافظ نے لکھا ہے ؎

صلاح کار کجا و من خراب کجا ؏ ببیں تفاوت رہ از کجا ست تا بکجا"[۵۲]

مرزا جلال اسیر کے متعلق فرمایا:-
"مرزا جلال اسیر علیہ الرحمۃ مختار ہیں اور ان کا کلام سند ہے۔ میری
کیا مجال کہ ان کے باندھے ہوئے لفظ کو غلط کہوں لیکن تعجب ہے اور
بہت تعجب ہے کہ امیرزادۂ ایران ایسا لفظ لکھے .... بے پیر
ایک لفظ ٹکسال باہر ہے ورنہ صاحب زبان ہونے میں اسیر بھی ظہوری
سے کم نہیں[۵۳]۔"

آگہی شیرازی کا شعر ہے ؎

بازآر دل خود از چنین کار ؏ آزار چہ می کنی دلم را

اس میں "آزار چہ میکنی" پر مرزا غالب نے اعتراض کیا ہے۔ کہتے ہیں:-

---

۵۱ ادبی خطوط غالب صفحہ ۱۵۰
۵۲ " " " " ۱۴۷، ۱۴۸
۵۳ " " " " ۱۴۹

"اٹی نے زبردستی کی ہے"[۹۱]

یہاں تک ایسی مثالیں جناب نے ملاحظہ فرمائیں جن میں مرزا غالب نے ان لوگوں سے انحراف کیا ہے جن کو وہ خود مسلم الثبوت کہہ چکے تھے۔ اب وہ بھی دو ایک دیکھ لیجئے جہاں اپنے مطلب کے لئے مرزا نے ایسوں کی سند مانی ہے جن کو وہ مستند علیہ نہیں سمجھتے تھے۔ اور اگر کوئی اور سند دیتا تو یقیناً رد کر دیتے۔ فرماتے ہیں:۔

"اگر معترض فیضی کو نہیں مانتا تو آپ معترض کو کیوں مانتے ہیں۔ فیضی کی سند مقبول اور مسموع"[۹۲]

نواب انوار الدولہ نے دریافت کیا کہ ارنی کی "ر" ساکن ہے یا متحرک اس کے جواب میں مرزا غالب نے جو سند میں دو شعر پیش کئے ہیں ان میں سے ایک تو خوان کا ہے اور دوسرا مرزا عبدالقادر بیدل جو دونوں فارسی نویسانِ ہند میں[۹۳]

مختصر یہ کہ خود ساختہ معیار کو خود ہی قدم قدم پر ڈھاتے جاتے ہیں۔ ابھی کچھ کہتے ہیں ابھی کچھ اور۔ گویا معیار و عیار کچھ نہیں۔ اصل معیار مرزا غالب کا قول ہے۔ اب جو جو اس سے متفق ہیں وہ سب مسلم الثبوت ورنہ نا قابلِ قبول۔

---

۹۱ ادبی خطوط غالب صفحہ ۱۶۹

۹۲ " " " " ۲۱۰

۹۳ " " " " ۹۰

مرزا قتیل کا بتایا ہوا معیار

مرزا غالب کا معیار آپ نے دیکھا۔ اصل میں انھوں نے اس کے قائم کرنے میں اصولی غلطی کی۔ یہ بات ہی شروع سے غلط ہے کہ ہر شخص انفرادی حیثیت سے بھی سند ہے بشرطیکہ وہ ایرانی ہے۔ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ ایرانیوں میں آپس میں کوئی اختلاف ہی نہیں۔ ورنہ پھر دو متضاد سندوں میں کسی ایک کو صحیح ٹھیرانے کی کیا صورت ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک ضرور غلط ہوگی۔ یہی غلطی تھی جس کی وجہ سے مرزا غالب کو اپنے بنائے ہوئے معیار کو اتنی بار بگاڑنا پڑا۔ اب دیکھئے مرزا قتیل کیا معیار پیش کرتے ہیں۔ اور پھر اصابت رائے اور سلامت طبع کی داد دیجئے:۔

"در ذکر زبان فارسی میگویم کہ برائے مقلد شعر فارسی ایران و توران ہر دو مستند است و از تورانیان زبان آذربائیجان بہتر است۔ اہل خراسان از اہل آذربائیجان فصیح ماندہ و شیرازیان بہ از خراسانیان و صفاہانیان بہ از ہمہ واشراف و اجلاف و شہرے و کوہے ایران صاحب زبان اند۔ در وقت حرف زدن پچی و مرزا صائب ہر دو برابر اند و زبان ہر دو سند۔ مگر بعضے اہل زبان مخرج بعضے حرف ندارند مانند ہندیان و در ہر فرقہ و ہر صنف یافتہ می شود کہ بعضے مخرج را ندارند۔ دریں صورت لفظے کہ از زبان اہل زبان برآید غلط باشد مثل تلطوم فیل بجائے خرطوم فیل۔ یا دیفار بجائے دیوار و کائے وبائے بجائے کار و بار یا آونشین بجائے آتشین یا شو بجائے شب و کلم بجائے قلم و نیز اگر از شعرائے ایران خطا در بحر یا قافیہ ہم افتد ہم سند نہ باشد۔ و تصرف ایشاں در الفاظ عربی بر وضع خود شاں و در الفاظ عجمی بطرق عرب صحیح بود مثل طلبیدن و فہمیدن و بلعیدن در الفاظ عربی و مانند مستشار و مزلف و مزیب و نزاکت و

غیر آں در الفاظ فارسی ۔ و نیز لفظے کہ چار شاعر عالی مرتبت استعمال نمودہ باشند سند باشد اگرچہ در اصل غلط بود ۔ یا دہ شاعر موزوں طبع ایران اتفاق بر آں نمایند یا علی العموم تلفظ بآں روا دارند"[۱]

مرزا قتیل نے ہندی فارسی دانوں کی عام غلطیاں اور ان کی مخصوص طرز تحریر جو گو صحیح فارسی ہوتی ہے لیکن ایرانی فارسی سے مختلف ہوتی ہے ان سب کو بتفصیل بیان کیا ہے ۔ پھر ایران کے مختلف حصوں کی مخصوص بولیوں کا بالتشریح ذکر ہے ۔ اس سے آگے صحیح تعلیم کی اہمیت بتائی ہے اور بتایا ہے کہ خواہ صحیح فارسی لکھنی آ جائے لیکن ایرانیت اسوقت تک نہیں آتی جب تک کم از کم یہ نہ ہو کہ کسی ایرانی سے فارسی حاصل کی جائے ۔ چار شربت میں بھی اس موضوع پہ بہت کچھ لکھا ہے ۔ ہندوستان کے بزعم خود اہل علم حضرات کے متعلق ارشاد ہوتا ہے :۔

"کتب ایشان دیدنی است ۔ عربی و فارسی و یونانی و سریانی و انگریزی و پوربی و پنجابی و مارواڑی را یکجا ساختہ اند ۔ و ہمہ را بزعم خود محاورہ اہل ایران

---

[۱] نہر الفصاحت صفحہ ۱۸۱ ۔ منصف مزاج حضرات اس معیار کی جامعیت اور اس کے باوجود اختصار کی داد دیں گے ۔ مرزا غالب بھی اس قسم کے مناسب معیار کے قائل تھے لیکن صرف اردو کے لیئے ۔ فرماتے ہیں " اس امر کے مالک اور اہل زبان ہم ہیں ۔ اور یہ ہم صیغۂ متکلم مع الغیر ہے یعنی ہم اور تم اور مجموع شرفا اور شعرا ر دہلی و لکھنؤ ۔ ایسے دس آدمی کا اتفاق سند ہے ۔ زیادہ جھگڑا بے فائدہ " اردوی خطوط صفحہ ۲۱۷ ۔
خبر نہیں مرزا نے ایسا ہی کوئی معیار فارسی کے لیئے کیوں نہ تجویز کیا ۔

تصور نمودہ اند۔ قطع نظر از نیکہ باغ زاغاں کہ در ہرات است آنرا اصفاہان بردہ اند و تسکر درہ کہ در کابل است آنرا ورقند ہا می جویند و بجائے حائے حطی جیم تازی خواندہ اند یا بالعکس ۔ چہ سر آمد دغو منض فارسی کہ از قلم بلاغت رقم زنجیدہ اند دلئے بر مقلد بیچارہ ۔ بعضے الفاظ را خود ہم تراشیدہ اند و در بعضے مصطلحات بمنے حسب دلخواہ داخل کردہ اند ۔ و در بعضے مواقع کلمہ را بر کلمہ دیگر افزودہ مجموع را یک اصطلاح فہمیدہ اند مثل ماجرا آب بردن در پی شعر بمعنی کار عجیب و غریب کردن ۔ شعر[۵۱]

"غیر از برائے یارستے تاب می برد ٭ ایں ماجرا بہ بیں چہ قدر آب می برد"

مرزا بیدل کی فارسی دانی | مختصر یہ کہ مرزا بیدل کی زندگی ہی فارسی زبان کی تعلیم و تعلم کے لئے وقف تھی ۔ ان کو فارسی سے عشق تھا ۔ اور اسی ذوق کی وجہ سے وہ مسلمان ہوئے اور اسی وجہ سے مذہب امامیہ اختیار کیا ۔ اٹھارہ سال کی عمر میں مرزا محمد باقر شہید اصفہانی کی تعلیم سے مسلمان ہوئے اور ان سے ہی فارسی کی درسیات پڑھیں ۔ " استغنا بدرجہ کمال تھا ۔ بے سرو پا خانہ بدوش پھرتے تھے[۵۲] " اور اہل کمال سے جو مل سکتا تھا حاصل کرتے تھے ۔ یہ تو خود غالب بھی مانتے ہیں کہ لکھنؤ میں جو ایرانی ادیب آتے رہتے تھے ان سے صحبتیں رہتی تھیں ۔ یوں بھی غالب کی بہ نسبت پچاس برس پہلے کا زمانہ تھا اور وہ کی حکومت نصف النہار پر تھی اور اس کے ساتھ فارسی تھی ۔ غالب بھی

---

[۵۱] چار شربت صفحہ ۵۲

[۵۲] نگار جنوری ۱۹۳۹ء صفحہ ۲۴

مانتے ہیں کہ "وہ اہلِ ایران کی تقریر سے مشابہ تحریر بنا تا تھا" یا بالفاظِ دیگر مرزا قتیل اسوقت کی ایرانی زبان اورمعاشرت سے خوب واقف تھے۔ یہی نہیں بلکہ قدما کا کلام بھی نہ صرف دیکھ رکھا تھا بلکہ مستحضر تھا۔ مولوی امیر احمد صاحب علوی کاکوروی بی۔ اے فرماتے ہیں:۔

"قوت حافظہ لاجواب تھی۔ تاریخ سلف پر زبان۔ عروض وقافیہ۔ الہیات وریاضیات میں ہرفن۔ زبان فارسی پر عبور کامل [۱]"

اس کا ثبوت اور اس کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے کہ ان کی تصانیف ملاحظہ فرمائی جائیں۔ شجرۃ الامانی۔ نہر الفصاحت۔ چار شربت۔ رقعات وغیرہ دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ غالباً مرزا غالب نے قتیل کی کتابیں پڑھے بغیر ان پر اعتراضات وارد کر دئیے۔ ورنہ وہ دیکھتے کہ قتیل نہ صرف محاورۂ اہلِ ایران سے واقف ہے بلکہ ایران کے مختلف صوبوں اور حصوں کے مخصوص محاوروں اور ان کے اختلافات سے بھی کما حقہٗ آگاہی رکھتے تھے۔ ان کی کتابوں کا بیشتر حصہ اسی میں صرف ہوا ہے کہ ہندیوں کو ہندی فارسی اور ایرانی فارسی کا فرق سمجھائیں۔ پھر اس سب کے بعد اگر کوئی مرزا غالب سے یہ بھی کہے اور بتائے کہ قتیل صرف ہندوستان ہی میں ایرانیوں کی صحبت سے فیض یاب نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ خاکِ پاکِ ایران کی بھی برسوں کوچہ گردی کی تھی تو کیا ارشاد ہوگا۔ سنئیے مولوی عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم کیا فرماتے ہیں:۔

---

[۱] حیاتِ مصحفی از مولوی امیر احمد صاحب علوی کاکوروی بی اے۔ نگار جنوری ۱۹۳۳ء

"لکھنؤ کے ابتدائی عروج میں ملا فائق اور پھر مرزا قتیل کا نام مشہور ہوا جو ایک نومسلم فارسی دان تھے۔ خود مرزا قتیل مذاقاً کہا کرتے تھے کہ "بوئے کباب مرا مسلمان کرد" مگر سچ تو یہ ہے کہ فارسی کی تعلیم اس کے شوق اور کمال فارسی دانی کی آرزو نے انھیں مسلمان ہونے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے محض اپنے شوق میں ایران کا سفر کیا۔ برسوں شیراز و اصفہان اور طہران و آذربائیجان کی خاک چھانی اور ادبِ فارسی کے اس کمال کو پہنچ گئے کہ خود اہلِ زبان بھی ایسے باکمال زباں داں پر حسد کریں تو تعجب کی بات نہیں۔"

مرزا غالب نے جا بجا مرزا قتیل پر حملے کئے ہیں۔ بے شک مرزا غالب کا مذاقِ فارسی اعلیٰ درجہ کا تھا۔ اور وہ اس اصول پر بار بار زور دیتے تھے کہ سوا اہلِ زبان کے کسی کا کلام سند نہیں ہوسکتا مگر ان کے زمانے میں چونکہ اودھ سے بنگالے تک لوگ مرزا قتیل کے پیرو تھے اور بات بات میں مرزا قتیل کا نام لیا جاتا تھا۔ اسلئے مرزا غالب کو اکثر طیش آگیا۔ اور جب پیروانِ قتیل نے ان کی خبر لینی شروع کی تو وہ کہنے لگے ؎

فیض از صحبتِ قتیلم نیست ✽ رشک بر شہرتِ قتیلم نیست
مگر آنانکہ فارسی دانند ✽ ہم بریں رائے و عہد و پیماں اند
کہ ز اہلِ زبان نہ بود قتیل ✽ ہرگز از اصفہان نہ بود قتیل
لاجرم اعتماد را نہ سزد ✽ گفتہ اش استناد را نہ سزد
کایں زبان خاص اہلِ ایران ست ✽ مشکل ما و سہل ایران است
سخنست آشکار و پنہاں نیست ✽ دہلی و لکھنؤ ز ایران نیست

لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ قتیل نے فارسی دانی میں جو کوششیں

کی تھیں اور اس میں واقفیت و کمال حاصل کرنے میں جو زندگی صرف کی تھی وہ بالکل بیکار گئی۔ اس بات کو ماننے میں کسی کو عذر نہیں ہو سکتا کہ قتیل کا کوئی دعویٰ جب تک وہ اہل زبان کی سند نہ پیش کریں قابل تسلیم نہیں۔ اور نہ قتیل کے ذہن میں کبھی یہ خیال گذرا ہوگا۔ لیکن اس کی خصوصیت قتیل کے ساتھ نہیں ہے۔ ہندوستان کا کوئی شخص بجائے خود سند نہیں ہو سکتا۔ خود مرزا نوشہ غالب بھی فارسی کا کوئی محاورہ بغیر اہل عجم سے ثبوت پیش کئے ہوئے استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ ہندوستانی فارسی دانوں کا اگر کچھ وقار قائم ہو سکتا ہے تو صرف اس بنا پر کہ کلام فارسی میں ان کی نظر وسیع ہے اور ہر ہر لفظ کے صحیح استعمال سے واقف ہیں۔ اور اس حیثیت سے سچ پوچھئے تو غالب کے مقابلہ میں قتیل کا پایہ بہت بلند تھا۔ غالب زندگی بھر ہندوستان کی خاک چھانتے رہے اور اسی کے ساتھ طلب معاش میں سرگردان رہے۔ قتیل کو اطمینان کا زمانہ ملا تھا۔ اور مدتوں خاک پاک ایران میں رہ کر گاؤں گاؤں کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے۔

بہرحال لکھنؤ کی فارسی دانی کا آغاز قتیل سے ہوا اور ان سے کچھ پہلے ملا فائق نے جن کا خاندان آگرہ سے آکر لکھنؤ میں بس گیا تھا ادب و انشاء فارسی اور فارسی نظم و نثر میں اعلیٰ درجہ کی بے نظیر کتابیں تصنیف کیں۔ فارسی گو اور فارسی دان ان سے پہلے بھی ہندوستان میں گذرے ہیں مگر فارسی دانی کے ساتھ زبان فارسی کے اصول و قواعد و ضوابط اور صرف و نحو کا مدوّن کرنے کا شوق پہلے پہل لکھنؤ ہی میں شروع ہوا۔ اور وہ انہی کے قلم سے ظاہر ہوا۔ ان کی کتابیں اگر سچ پوچھئے تو لاجواب د

سے بے مثل ہیں"[۹۱]

زباندانی میں سماعی اور قیاسی علم کی بحث

زبان دانی کے متعلق اہل الرائے اور قابل قدر ہستیوں سے اظہار خیالات کے بعد خود میرا کچھ کہنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے لیکن مرزا غالب نے جو ایک چیز پر اکثر زور دیا ہے اس کے متعلق کچھ اپنے خیالات پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں فرہنگ نویسوں کے متعلق مرزا کہتے ہیں :-

"قواعد فارسی کا رسالہ اہل زبان میں سے کس نے لکھا ہے اور ان ہوس پیشہ فرہنگ لکھنے والوں نے وہ رسالہ کس فاضل عجم سے پڑھا ہے۔ شیدائے ہندی سکروی نے حاجی محمد جان قدسی علیہ الرحمۃ کے ایک شعر پر اعتراض کیا ہے۔ مرزا جلالائے طباطبائی علیہ الرحمۃ نے شیدا کو خط لکھا کہ سر آغاز خط کا ایک قطعہ جس میں صحرا و دریا قافیہ اور برساند ردیف ہے شعر آخر کا مصرعہ ثانی یاد رہ گیا ع - یعنی بہا در لومفوی برساند ۔ خلاصہ مضمون خط یہ ہے کہ نہ تو صاحب زبان ہے نہ زبان دان ہے - یعنی نقاد اور شناسہ لیس اہل ایران ہے ۔ حاجی محمد جان کو سند پکڑ تجھ سے کس نے کہا ہے کہ اس سے روایت[۹۲] کیا تو نے نہیں سنا جو عرفی اور فیضی میں گفتگو ہوئی ہے ۔

---

[۹۱] اقتباس از رسالہ دلگداز نمبر ۵ جلد ۱۶ برائے ماہ مئی ۱۹۱۵ء۔ "ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" یہ مضمون مولانا شرر مرحوم نے دلگداز میں سلسلہ وار لکھا تھا جو جنوری ۱۹۱۴ء میں شروع ہوا اور ۱۹۱۵ء میں بھی جاری رہا ۔ اس میں لکھنؤ کی حالت کا بہت کچھ مکمل بیان ہے ۔

[۹۲] اعتراض کی نوعیت کا پتہ نہیں چلتا ۔ لیکن عام طور پر اس قسم کے (باقی صفحہ ۱۲۵ پر)

اور مؤتمن الدولہ شیخ ابوالفضل کے رد برو ہوئی ہے۔ لغات فارسی اور ترکیب الفاظ میں کلام تھا۔ مولانا جمال الدین عرفی علیہ الرحمۃ نے کہا کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اور نطق سے آشنا ہو گیا ہوں اپنے گھر کی بڑھیوں سے لغات فارسی اور یہی ترکیبیں سنتا رہا ہوں فیضی بولا کہ جو کچھ تم نے گھر کی بڑھیوں سے سیکھا ہے وہ ہم نے خاقانی اور انوری سے اخذ کیا ہے۔ حضرت عرفی نے فرمایا کہ تقصیر معاف خاقانی اور انوری کا ماخذ بھی تو منطق گھر کی پیرزالوں کا ہے"[۹۱]

آگے لکھا ہے :-

"دکنی (صاحب برہان قاطع) کے قیاس کی غلطی اگر نہ سب جگہ بلکہ بعض جگہ سچ جانتے ہو"[۹۲]

ایک اور جگہ لکھا ہے :-

"وارستہ سیالکوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا ہے اور ہر اعتراض بجا ہے۔ بایں ہمہ وہ بھی جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے منہ کی کھاتا ہے"[۹۳]

(بقیہ گذشتہ) اور پچھے جواب اسی وقت سنے جاتے ہیں جب کوئی لاجواب ہو جائے۔ اُردو میں بھی اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے۔ مولوی عبدالغفور خاں نے میر انیس پر کئی اعتراض وارد کئے۔ ناسخ کے شاگردوں میں سے بعض لکھنوی حضرات نے جواب دئے اور جہاں لاجواب ہو گئے وہاں یہی کہا کہ انیس جو کہیں وہی سند ہے بنگال والوں کو کیا حق ہے کہ اہل زبان پر اعتراض کریں۔

۹۱ ادبی خطوط غالب صفحہ ۱۱۳ و ۱۱۴

۹۲ " " "

۹۳ " " " ۸۴

مختصراً مرزا غالب کا دعویٰ ہے کہ علم زبان دانی غیر اہلِ زبان کے لئے محض سماعی حد تک درست ہے قیاس کا اس میں گذر نہیں۔ اس دعویٰ کے صحیح ہونے میں مطلق شبہ نہیں پہلے زبان بنی اور پھر قواعد۔ قواعد سے زبان نہیں بنتی۔ بلکہ زبان کے لئے ایسے قواعد بنائے جاتے ہیں جن کا اطلاق عام اور وسیع ہو۔ پھر اگر قاعدوں کے خلاف کوئی بات رہ جاتی ہے (اور ایسی بے شمار ہیں) تو ان کو غلط نہیں کہا جا سکتا بلکہ ان کو مستثنیات میں رکھا جاتا ہے۔ گویا قاعدے زبان کو منضبط کرنے کے لئے بنائے جاتے ہیں نہ کہ قیاس آرائی کے لئے۔ اور اسی لئے قیاس خواہ قاعدے کے موافق ہی کیوں نہ ہو اس وقت تک صحیح نہیں مانا جا سکتا جب تک کہ جمہور اہلِ زبان اس سے متفق نہ ہوں۔ لیکن مرزا غالب نے جو اپنے دعوے میں غیر اہلِ زبان کی شرط لگائی ہے وہ نہ صرف غیر ضروری بلکہ غلط ہے۔ زبان تو ایسی چیز ہے کہ اہلِ زبان بھی محض قیاس پر مطلق نہیں چل سکتا۔ بلکہ صرف سماعی علم کی حد تک رہنا پڑتا ہے۔ اور یہی چیز اس کو اہلِ زبان بناتی ہے۔ اور غیر اہلِ زبان پر فوقیت دیتی ہے کہ اس کا سماعی علم اس قدر وسیع ہوتا ہے کہ اس کو قیاس آرائی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ کسی کو حق نہیں کہ قیاس کی بنا پر کسی لفظ کے نئے معنی یا کسی ترکیب کا نیا استعمال کر بیٹھے۔ اس میں اہلِ زبان اور زبان داں دونوں بالکل برابر ہیں۔ غلطی غلطی سمجھی جائیگی خواہ وہ اہلِ زبان کی قیاس آرائی کا نتیجہ ہو خواہ زبان داں کی۔ مثلاً۔ اردو میں ایک محاورہ ہے "دھک سے رہ جانا" غالباً اس مناسبت سے میر انیس نے "فق سے ہو جانا" قیاس کر لیا۔ ع

رنگِ رُخِ کفارِ عرب ہو گیا فق سے

اگرچہ یہ غدائے سخن کا قیاس ہے۔ لیکن قطعی غلط۔

یہ صحیح ہے کہ زندہ زبان کے لئے ضروری ہے کہ بڑھے اور وسیع ہو۔ اور اس کے لئے ضرورت ہے کہ نئے الفاظ۔ نئی تراکیب اور نئے اسلوب نکالے جائیں۔ یہ کام ان لوگوں کا ہے جن کا علم کامل اور مذاق سلیم ہوتا ہے۔ اس میں بھی اہل زبان اور زبان داں کی تخصیص نہیں۔ لیکن زبان کا معاملہ ایسا نہیں جیسا کہ کسی سائنس کا ہے کہ محقق نے نئی بات دریافت کی اس کا عقلی اور عملی ثبوت دیا اور وہ قابل قبول سمجھی گئی۔ یہاں صاحب ذوق اصحاب نئے نئے الفاظ اور معانی ڈھالتے رہتے ہیں۔ اور ملک کے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں۔ شروع شروع میں سب نئے لہٰذا غیر سندی اور قیاسی ہوتے ہیں۔ عام طور پر ان سب کی مخالفت بھی ہوتی ہے۔ لیکن زمانہ ان کی کسوٹی ہے۔ بعض سکّے چل جاتے ہیں اور کھرے سمجھے جانے لگتے ہیں۔ بعض کھوٹے کے کھوٹے رہتے ہیں اور ٹکسال باہر سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن جیسا عرض کیا گیا اس دار الضرب کے کارندوں کے لئے ملکی اور غیر ملکی کی تخصیص نہیں۔ صرف علم صحیح اور مذاق سلیم کی ضرورت ہے۔ بہرحال اس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ سماعی اور قیاسی قید اہل زبان اور زبان داں دونوں پر برابر ہے۔ اہل زبان کی یہ فوقیت ہے کہ اس کے سماعی علم کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ نہ صرف کتابوں اور استادوں سے زبان سیکھتا ہے بلکہ شروع ہی سے گھر اور باہر دہی زبان اور اس کے محاورے سنتا اور سیکھتا ہے زباں داں کا زیادہ تر استادوں اور ان کی کتابوں پر دار و مدار ہوتا ہے۔ نوعیت ایک ہی ہے وسعت میں فرق ہے۔ پھر اگر اس میں کوئی زباں داں برسوں اہل زبان کے ملک میں جا کر رہے اور اس نیت اور ارادہ سے رہے کہ وہاں

کی زبان اور محاورے بہ ہزار کوشش حاصل کرے ۔ ہر وقت اس تلاش اور تجسّس میں رہے کہ وہاں کے اسالیب بیان ۔ طرز اظہار ، الفاظ و معانی وہاں کے مستند علما و ادبا سے حاصل کرے تو ظاہر ہے کہ ایسے شخص کا رتبہ زبان میں بھی ایک عام اہلِ زبان سے بہت بلند ہوگا ۔

ہندوستان میں فارسی دانی کے دعوے اور اس پر شیخی بھی کچھ عجیب بے معنی سی بات ہے ۔ خصوصاً ان لوگوں کے لئے جنھوں نے نہ ایران دیکھا نہ وہاں کی زندگی سے آشنا اس زبان میں معمولی بات چیت نہ کر سکیں خط لکھنے میں تکلف ہو ۔ وہاں کے ادب موجودہ اور ارتقائے زبان سے مطلق واقفیت نہ ہو لیکن زور شور یہ کہ یہ صحیح اور وہ غلط ۔ کسی غیر زبان میں صحت اور عدم صحت اور اس سے بھی زیادہ بندش کی نزاکت اور ترکیب کی شیرینی کے متعلق بھلا کوئی غیر اہلِ زبان کیا کہہ سکتا ہے ۔ کیا کہہ سکے ۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ جو قدما کہہ گئے ہیں ان کی نقل ہو ۔ سو اس میں نئی بات اور نزاکت کیا ہوئی اگر نئی بات کہیں گے تو قیاس پر دار و مدار ہوگا جو خواہ ٹھیک ہی ہو لیکن اس پر اعتبار ہی کیا جب تک اہلِ زبان اس کو نہ مانیں سو اس کا امکان نہیں ۔ اہلِ زبان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ " گاؤ آمد و خر رفت " زبان میں الہام یا وجدان سب بے معنی چیز ہے ۔ خود ہی اپنے منہ میاں مٹھو بن کر اگر جی خوش ہوتا ہے تو خیر ورنہ اور تو ہمارے بلند آہنگ دعووں کا کوئی مصرف معلوم نہیں ہوتا ۔ غالب ہی کو لے لیجئے ۔ وہ ان کا فارسی دیوان جو الہام سے بھی کچھ بڑھ کر ہے وہ کہاں ہے ۔ ہندوستان تباہ و برباد سہی ۔ مانا کہ یہاں فارسی ذوق مردہ ہو گیا لیکن ایران کو کیا ہوا ۔ وہاں تو اب تک فارسی ہی زبان رائج ہے ۔ زندہ قوم ہے

ہر طرح مرزا غالب کی پسندیدہ۔ وہاں کہیں نہ مرزا غالب کے دیوانِ فارسی کو پوچھا گیا۔ آخر ۱۹۴۳ء میں جناب آغا سید محمد اشرف صاحب ایم۔ اے پروفیسر فارسی گورڈون ہائی سکول۔ ڈیرہ دون۔ ایران کی سیاحت سے واپس تشریف لائے ہیں۔ فرماتے تھے کہ ایران میں غالب یا ان کے دیوان کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ یہ بھی نہیں کہ ملک کی موجودہ ترقی کی وجہ سے شعر و شاعری اور خصوصاً پرانے زمانے کی شاعری سے ان لوگوں کو کوئی لگاؤ اب نہیں رہا ہے۔ آغا صاحب موصوف فرماتے تھے کہ حافظ و دیگر فارسی شعراء کو اسی ذوق و شوق اور فریفتگی سے پڑھا جاتا ہے جیسا کہ ہمیشہ سے ہے۔

غالب کی نثر تو نظم سے بھی کم اچھی سمجھی گئی۔ شیخ محمد اکرام صاحب فرماتے ہیں:-

"اس میں شک نہیں کہ خواہ مرزا خود کچھ کہیں۔ انھوں نے نثر میں اکثر ان فارسی نثر نویسوں کا اتباع کیا ہے جن کی تصنیفات بیشتر ہندوستان میں لکھی گئیں۔ اور اس امر پر قریباً قریباً سبھی فارسی اہلِ زبان متفق ہیں کہ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر ترکی یا مغل بادشاہوں کی سرپرستی میں جو فارسی کتابیں لکھی گئیں ان کا طرزِ تحریر بھی کسی طرح قابلِ تقلید نہیں"[۵۹]

یہ ہے گویا غالب کی نظم و نثر پر اہلِ ایران کا فیصلہ

ماحصلِ کلام قصہ تو بہر حال مرزا قتیل کا تھا۔ آخر میں اس تمام بحث کا یہ نتیجہ نکالنا میرے نزدیک غلط نہیں کہ صرف "خاک نبود" کی بدعت کے علاوہ مرزا غالب

---

[۵۹] غالب نامہ صفحہ ۵۳

کوشش خواہش اور کاوش کے باوجود بھی مرزا قتیل کے کلام میں کوئی غلطی نہ نکال سکے خطا اور سہو اسوائے نبی ہر انسان کے خمیر میں ہے۔ اور انسانیت کی صف سے تو مرزا غالب بھی خارج نہیں۔ متقدمین ہوں یا متاخرین سب کے کلام میں خطا اور سہو کی مثالیں ملتی ہیں۔ پھر بے چارے مرزا قتیل بلکہ انکی سات پیڑھی کو ایک سہو کی سزا میں اکٹ کر رکھ دینا۔ شرمناک گالیاں اور عریاں صلواتیں سنانا۔ تذلیل و تحقیر کرنا اور پھر اس پہ بغلیں بجانا۔ کہاں کا انصاف اور کیسی تہذیب ہے۔ یہاں افسوس کے ساتھ یہ لکھنا پڑتا ہے کہ مرزا غالب نے اس قسم کے متعصبانہ اور مبتذل رویہ سے کچھ اپنی ہی توقیر میں کمی کر لی۔ مرزا قتیل تو ان گالیوں سے زندہ ہو گئے ؎ قتیل

از نام بدم گفتی قربان زبان تو ٭ دشنام بمن دادی شکر بدہان تو

خاتمہ — یہ مختصر سا رسالہ نذر ناظرین کرتے ہوئے میں خائف بھی ہوں کہ اس میں بہت سی سخن گسترانہ باتیں آپڑی ہیں۔ رائے کی یہ آزادی اکثروں کو بالکل نہ بھائے گی۔ اور پرستاران غالب ممکن ہے وہ کچھ کہیں کہ ع اٹھائے نہ اٹھے اور بنائے نہ بنے + ہمارے ہاں علمی بحث عموماً فوراً ہی ذاتیات میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جس کا جواب خاموشی کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ ایسے حضرات کی آسانی کے خاطر میں خود ہی بصدق دل اپنی کم مائیگی بے علمی اور بے بضاعتی کا اقرار کیے لیتا ہوں۔ اور یہ محض برائے بیت نہیں۔ بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا، بالکل بصدق دل وبسلامتئ ہوش و حواس۔

آخر میں ایک بات پھر عرض کر دوں۔ کہ اس بحث کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ مرزا غالب کی اہمیت یا علمیت میں مجھے کلام ہے۔ مجھ ان کی منتخب

اُردو شاعری کے بے مثل اور انمول ہونے کا اعتراف ہے۔ میں ان کے ایک ایک منتخب شعر کا گرویدہ ہوں۔ مختصر یہ کہ میرے دل میں مرزا غالب کی اُردو شاعری اور اُردو رقعہ نگاری کی ایسی ہی اور اتنی ہی قدر ہے جتنی کہ شاید کسی بھی غالب کے شیدائی کو ہو۔ یعنی میں ان کے منتخب اُردو کلام کو الہامی ماننے کے لئے تیار ہوں ہاں خود ان کو نبی ماننے میں مجھے کلام ہے۔

م١٩ ٨٩١٥٤٣١٠٩

(ق ع)

٣٢٧٤٣

Date	No.	Date	No.